الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

اکثر لوگ اپنے آپ کو صد فی صد استعمال نہیں کرتے
یہی وجہ ہے کہ اکثر لوگ ——————
اپنے مقصد میں صد فی صد کامیاب نہیں ہوتے

اپریل ۱۹۸۶ شمارہ ۱۱۳

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

اللہ اکبر	40/-
تذکیر القرآن جلد اوّل	80/-
الاسلام	25/-
مذہب اور جدید چیلنج	25/-
ظہورِ اسلام	25/-
احیاءِ اسلام	20/-
پیغمبرِ انقلاب	30/-
سوشلزم اور اسلام	25/-
صراط مستقیم	25/-
اسلامی زندگی	20/-
اسلام اور عصر حاضر	20/-
دین کیا ہے	3/-
قرآن کا مطلوب انسان	6/-
تجدیدِ دین	4/-
اسلام دینِ فطرت	4/-
تعمیرِ ملت	4/-
تاریخ کا سبق	4/-
مذہب اور سائنس	6/-
عقلیاتِ اسلام	4/-
فسادات کا مسئلہ	2/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	2/-
تعارف اسلام	4/-
اسلام پندرھویں صدی میں	4/-
راہیں بند نہیں	4/-

ایمانی طاقت	4/-
اتحادِ ملت	4/-
سبق آموز واقعات	4/-
زلزلۂ قیامت	5/-
حقیقت کی تلاش	4/-
پیغمبر اسلام	4/-
حقیقتِ حج	4/-
آخری سفر	4/-
اسلامی دعوت	4/-
خدا اور انسان	4/-
حل یہاں ہے	6/-
سچّا راستہ	2/-
دینی تعلیم	4/-
حیاتِ طیبہ	4/-
باغِ جنت	4/-
نارِ جہنم	4/-
تبلیغی تحریک	12/-
دین کی سیاسی تعبیر	10/-
عظمتِ قرآن	25/-

Muhammad: The Prophet of Revolution	50/-
The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Muhammad: The Ideal Character	4/
Man Know Thyself	4/-

مکتبہ الرسالہ سی - ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اُردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۱۳ — اپریل ۱۹۸۶

فہرست

	صفحہ		
ناقص تشریح	۲	حرص اور قناعت	۱۷
اصل اور تفصیل	۳	بے چین روح	۱۸
خود ساز، تاریخ ساز	۴	صحیح اندازِ کار	۲۰
ایک آیت	۵	خدا کی سنت	۲۱
جھوٹا یقین	۶	سفر نامہ امریکہ (دوسری قسط)	۲۴
بے فائدہ علم	۷	اسلامیت کیا ہے	۴۳
افراد کی اہمیت	۸	عجیب لوگ	۴۴
عورت کے بارہ میں	۱۰	خبر نامہ اسلامی مرکز	۴۵

ناقص تشریح

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ میں نے جن اور انسان کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں (الذاریات ۵۶) اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے ایک مشہور مصنف لکھتے ہیں: "عبادت کا لفظ اس آیت میں محض نماز، روزے اور اسی نوعیت کی دوسری عبادات کے معنی میں استعمال نہیں کیا گیا ہے کہ کوئی شخص اس کا مطلب یہ لے لے کہ جن اور انسان صرف نماز پڑھنے اور روزے رکھنے اور تسبیح و تہلیل کرنے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ یہ مفہوم بھی اگرچہ اس میں شامل ہے مگر یہ اس کا پورا مفہوم نہیں ہے۔ اس کا پورا مفہوم یہ ہے کہ جن اور انسان اللہ کے سوا کسی اور کی پرستش، اطاعت، فرماں برداری اور نیازمندی کے لیے پیدا نہیں کیے گئے ہیں۔ ان کا کام کسی اور کے سامنے جھکنا، کسی اور کے احکام بجالانا، کسی اور سے تقویٰ کرنا، کسی اور کو اپنی قسمتوں کا بنانے اور بگاڑنے والا سمجھنا، اور کسی دوسری ہستی کے آگے دعا کے لیے ہاتھ پھیلانا نہیں ہے۔"

مذکورہ تشریح میں عبادت کو چار چیزوں کا مجموعہ بتایا گیا ہے ——— پرستش، اطاعت، فرمانبرداری نیازمندی۔ محترم مصنف کے نزدیک یہ عبادت کا "پورا مفہوم" ہے۔ لیکن گہرائی کے ساتھ دیکھا جائے تو یہ پورا مفہوم اس کا صرف ناقص مفہوم ہے۔

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ محبت نام ہے چار چیزوں کا: دل سے چاہنا، ملاقات کرنا، باتیں کرنا، ایک ساتھ کھانا۔ تو اس کو محبت کا ناقص مفہوم کہا جائے گا نہ کہ اس کا پورا مفہوم۔ کیوں کہ محبت چار چیزوں کا مجموعہ نہیں۔ محبت اصلاً صرف ایک چیز کا نام ہے اور وہ دل سے چاہنا ہے۔ اس کے سوا جو چیزیں ہیں وہ محبت کے مظاہر ہیں نہ کہ محبت کے مجموعہ کے چار مساوی اجزاء۔

اسی طرح عبادت اصلاً صرف ایک چیز کا نام ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ آدمی حقیقی معنوں میں اپنے رب کا پرستار بن جائے۔ بقیہ جو چیزیں شریعت میں ہیں وہ اسی اصل عبادت کے مظاہر ہیں۔ وہ اس اصل عبادت کے پیدا ہونے کے بعد لازمی نتیجہ کے طور پر آدمی کی زندگی میں ظہور کرتی ہیں۔ اگر پرستاری ہوگی تو بقیہ چیزیں بھی ہوں گی، اور اگر پرستاری نہیں ہوگی تو یقینی طور پر بقیہ چیزیں بھی نہیں ہوں گی۔

حقیقت یہ ہے کہ اس تشریح نے عبادت کے مفہوم کو محدود کر دیا، اگرچہ نادانی کی بنا پر محترم شارح یہ سمجھ رہے ہیں کہ انھوں نے اس کو جامع اور مکمل بنایا ہے۔

اصل اور تفصیل

بیج ایک بہت چھوٹا دانہ ہے۔ اس سے ایک بہت بڑا درخت نکلتا ہے۔ اس بیج اور اس درخت میں جو باہمی نسبت ہے وہ محدود اور مکمل کی نہیں ہے بلکہ اصل اور تفصیل کی ہے۔ درخت اپنے بیج کی تفصیل ہے نہ یہ کہ اس نے محدود کو مکمل کیا ہے۔

یہی معاملہ فکر اور عمل کا ہے۔ فکر آدمی کے اندر ہے اور اس کے اعمال بے شمار صورتوں میں اس کے باہر پھیلے ہوئے ہیں۔ مگر انسان کے فکر اور انسان کے عمل کے درمیان محدود اور مکمل کی نسبت نہیں۔ یہاں دوبارہ اصل اور تفصیل کی نسبت ہے۔ انسان کے پھیلے ہوئے اعمال اس کے فکر کی تفصیل ہیں نہ کہ وہ محدود کو مکمل کر رہے ہیں۔

اسی طرح خدا کے دین کی بھی ایک اصل ہے، اور ایک اس کی تفصیل۔ خدا کے دین میں اصل کی حیثیت توحید کو حاصل ہے۔ اس کے سوا جو دینی احکام ہیں وہ سب اسی اصل کی تفصیل ہیں۔ عقیدۂ توحید اور احکامِ شریعت میں اصل اور تفصیل کی نسبت ہے نہ کہ محدود اور مکمل کی نسبت۔ یہ عقیدہ کی تصغیر ہے کہ اس کو محدود اور مسائل و احکام کو مکمل کہا جائے۔

قرآن میں بہ مشکل چند سو احکامی آیتیں ہیں۔ مگر فقہ کو دیکھیے تو اس میں آپ کو کئی لاکھ احکام ملیں گے۔ کیا قرآن محدود ہے اور فقہ اس کے مقابلہ میں مکمل ہے۔ نہیں۔ قرآن اور فقہ کا معاملہ بھی وہی ہے جس کا اوپر ذکر ہوا۔ قرآن اصل ہے اور فقہ اس کی تفصیل ہے۔

ایمان و اسلام کو قرآن میں درخت سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ اسلام سب سے پہلے دل کی زمین میں جڑ پکڑتا ہے، اس کے بعد وہ آدمی کی خارجی زندگی میں پھیلتا ہے۔ اسی طرح اسلام پہلے فرد کے اندر قائم ہوتا ہے، اس کے بعد وہ اجتماع میں ظہور کرتا ہے۔ گویا انفرادی دین اصل ہے اور اجتماعی دین اس کی تفصیل۔

یہ دنیا خدا کی دنیا ہے۔ خدا کی دنیا میں ایک چیز اور دوسری چیز کے درمیان اصل اور تفصیل کی نسبت ہے نہ کہ محدود اور مکمل کی نسبت۔ اس دنیا میں جس نے بیج لگایا اس نے درخت لگایا، اور جس نے درخت لگایا اس نے کچھ بھی نہیں لگایا۔

خود ساز، تاریخ ساز

آدمی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک خود ساز، اور دوسرے تاریخ ساز۔ خود ساز آدمی کی توجہات کا مرکز اس کی اپنی ذات ہوتی ہے۔ اور تاریخ ساز آدمی کی توجہات کا مرکز وسیع تر انسانیت۔

خود ساز آدمی کی سوچ اس کی ذاتی مصلحتوں کے گرد بنتی ہے۔ اس کے جذبات وہاں بھڑکتے ہیں جہاں اس کے ذاتی فائدہ کا کوئی معاملہ ہو۔ اور جس معاملہ کا تعلق اس کے ذاتی فائدے سے نہ ہو وہاں اس کے جذبات میں کوئی گرمی پیدا نہیں ہوتی۔

خود ساز آدمی اپنے ذاتی نفع کے لیے ہر دوسری چیز کو قربان کر سکتا ہے، خواہ وہ کوئی اصول ہو یا کوئی قول و قرار، خواہ وہ کوئی اخلاقی تقاضا ہو یا کوئی انسانی تقاضا۔ وہ اپنی ذات کے لیے ہر دوسری چیز کو بھلا سکتا ہے، وہ اپنی خواہشات کے لیے ہر دوسرے تقاضے کو نظر انداز کر سکتا ہے۔

تاریخ ساز انسان کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔ وہ اپنی ذات کے خول سے نکل آتا ہے۔ وہ برتر مقصد کے لیے جیتا ہے۔ وہ اصولوں کو اہمیت دیتا ہے نہ کہ مفادات کو۔ وہ مقصد کے لیے تڑپنے والا انسان ہوتا ہے نہ کہ مفاد کے لیے تڑپنے والا انسان۔ وہ اپنے آپ میں رہتے ہوئے اپنے آپ سے جدا ہو جاتا ہے۔

تاریخ ساز انسان بننے کی واحد شرط خود سازی کو چھوڑنا ہے۔ آدمی جب اپنے کو فنا کرتا ہے اسی وقت وہ اس قابل بنتا ہے کہ وہ تاریخ ساز انسانوں کی فہرست میں شامل ہو سکے ——— اس کے دل کو جھٹکے لگیں پھر بھی وہ اس کو سہہ لے۔ اس کے مفاد کا گھروندا ٹوٹ رہا ہو پھر بھی وہ اس کو ٹوٹنے دے۔ اس کی بڑائی اس کی آنکھوں کے سامنے مٹائی جائے پھر بھی وہ اس پر کوئی رد عمل ظاہر نہ کرے۔

تاریخ سازی کے لیے وہ افراد درکار ہیں جو خود سازی کی خواہشات کو اپنے ہاتھ سے ذبح کرنے پر راضی ہو جائیں۔ جو صرف اپنے فرائض کو یاد رکھیں اور اپنے حقوق سے دستبرداری پر خود اپنے ہاتھ سے دستخط کر دیں۔

ایک آیت

یاایھاالذین امنوا ان جاءکم فاسق بنبأ فتبینوا ان تصیبوا قومًا بجھالۃ فتصبحوا علیٰ مافعلتم نٰدمین (الحجرات ٦)

اے ایمان والو، اگر کوئی فاسق آدمی تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو خوب تحقیق کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تم کسی قوم کو نادانی سے ضرر پہنچادو، پھر تم کو اپنے کیے پر پچھتانا پڑے۔

یہ قرآن کی ایک آیت ہے۔ اگر کوئی شخص ایک ایسا قرآن چھاپے جس میں اس کی یہ آیت حذف کردی گئی ہو تو تمام دنیا کے مسلمان اس کو کافر قرار دیں گے اور مطالبہ کریں گے کہ اس کے خلاف سخت ترین کارروائی کی جائے۔ مگر یہی مسلمان قرآن کی اس آیت کو عملاً اپنی زندگیوں سے حذف کیے ہوئے ہیں اور کوئی نہیں جو اس کے خلاف ہنگامہ کرنے کی ضرورت محسوس کرتا ہو۔

قوم کے اصاغر ہوں یا قوم کے اکابر آج سب کا یہ حال ہو رہا ہے کہ جو کچھ سنتے ہیں اس کو مان لیتے ہیں کوئی نہیں جس کے اندر یہ مزاج ہو کہ وہ جس بات کو سنے پہلے اس کی تحقیق کرے۔ اس کے بعد اس کو بیان کرے۔ ہر آدمی کا یہ حال ہو رہا ہے کہ کسی کے خلاف جو بات بھی سنی اس کو فوراً مان لیا اور اس طرح بیان کرنا شروع کردیا جیسے کہ وہ بالکل واقعہ ہے۔

مسلمان قرآن کے محفوظ کتاب ہونے پر فخر کرتے ہیں۔ مگر اس قسم کا فخر خدا کے یہاں کسی کے کچھ کام نہ آئے گا۔ یہ بلاشبہ صحیح ہے کہ قرآن لفظی اعتبار سے مکمل طور پر محفوظ ہے۔ مگر اس حفاظت کا کریڈٹ مسلمانوں کو ملنے والا نہیں۔ کیوں کہ یہ حفاظت خدا کی طرف سے ہے۔ قرآن کی لفظی حفاظت براہ راست خدا کی طرف سے کی جارہی ہے۔ مگر اس کی عملی حفاظت مسلمانوں کو کرنا تھا۔ اور مسلمان یہاں ناکام ہو کر رہ گیے۔

آج مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ اپنے ایک ہم قوم یا ہم وطن کے خلاف کوئی بات سنیں تو وہ فوراً اس کو درست مان لیتے ہیں۔ وہ اس کی بالکل ضرورت نہیں سمجھتے کہ وہ اس کی تحقیق کریں اور تحقیق کے بعد اس کے بارہ میں اپنی رائے قائم کریں۔ کسی قوم کا یہ رویہ خدا کے غضب کو دعوت دینے والا ہے نہ کہ اس کی رحمت کو کھینچنے والا۔ اس عمل کے ساتھ مسلمان اگر "تحفظ قرآن" کا نعرہ لگا رہے ہوں تو ایسا نعرہ صرف ان کے جرم کو بڑھائے گا، وہ کسی اعتبار سے بھی اس کو کم کرنے والا نہیں۔

جھوٹا یقین

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اپنے مخالفین کے ساتھ جو جنگیں پیش آئیں ان میں سے ایک جنگ وہ تھی جس کو جنگ احد کہا جاتا ہے۔

اس جنگ میں بعض وجوہ سے مسلمانوں کو شکست ہوئی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سخت زخمی ہو گیے۔ مسلمانوں کی فوج منتشر ہو گئی۔ روایات میں آتا ہے کہ جب مخالفین نے دیکھا کہ ان کی فتح مکمل ہو چکی ہے تو ان کے سردار ابوسفیان (جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے) ایک ٹیلہ پر چڑھے اور مسلمانوں کے مقابلہ میں اپنی فتح کا اعلان کرتے ہوئے بلند آواز سے کہا:

لنا عزّیٰ ولا عزّیٰ لکم — ہمارے پاس عزّیٰ ہے اور تمہارے پاس کوئی عزّیٰ نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو صحابہ سے فرمایا کہ تم اس کا جواب اس طرح دو:

اللہ مولانا ولا مولیٰ لکم — اللہ ہمارا کارساز ہے اور تمہارا کوئی کارساز نہیں

عزّیٰ قدیم عرب کا ایک بڑا بت تھا۔ عرب کے مشرکین کو اس بت پر زبردست یقین تھا۔ اگر انھیں یقین نہ ہوتا تو اس نازک موقع پر ان کے سردار کی زبان سے یہ جملہ نہ نکلتا کہ لنا عزّیٰ ولا عزّیٰ لکم۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک جھوٹی چیز پر بھی ایک آدمی کو کتنا گہرا یقین ہو سکتا ہے۔ عزّیٰ محض ایک پتھر کا مجسمہ تھا۔ اس سے زیادہ وہ اور کچھ نہ تھا۔ مگر قدیم عرب کے مشرکین کو یقین تھا کہ اس عزّیٰ کی وجہ سے ان کو مسلمانوں کے اوپر فتح حاصل ہوئی ہے۔ عزّیٰ کی اہمیت ان کے نزدیک پیغمبرِ آخر الزماں اور آپ کے اصحاب کرام سے بھی زیادہ تھی۔ جو فخر آج مسلمانوں کو اپنے پیغمبر اور اصحاب پیغمبر پر ہے وہی فخر اس وقت کے مشرکین کو اپنے عزّیٰ پر تھا۔

جھوٹا یقین ہر دور میں انسان کا سب سے بڑا مرض رہا ہے۔ وہ آج کے لوگوں میں بھی اتنا ہی عام ہے جتنا کہ وہ پچھلے زمانہ کے لوگوں میں عام تھا۔ سچائی کو اس دنیا میں صرف وہ شخص پاتا ہے جو جھوٹے یقین کے خول کو توڑ کر اس کے باہر آسکے۔

بے فائدہ علم

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم : انا من غیر الدجال اخوف علیکم من الدجال. فقیل وما ھو یا رسول اللہ ۔ فقال علماء السوء (رواہ احمد من حدیث ابی ذر)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ۔ میں تمہارے بارہ میں دجال سے بھی زیادہ دوسروں سے ڈرتا ہوں۔ کہا گیا کہ اے خدا کے رسول یہ دوسرے لوگ کون ہیں ۔ فرمایا کہ برے علماء ۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم : من ازداد علماً ولم یزدد ھدیً لم یزدد من اللہ الا بُعدًا (رواہ ابو منصور الدیلمی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : جو شخص علم میں بڑھ جائے مگر وہ ہدایت میں نہ بڑھے وہ اللہ سے صرف دوری میں بڑھے گا ۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم : اشد الناس عذابًا یوم القیامۃ عالم لم ینفعہ اللہ بعلمہ (رواہ ابو داؤد الطیالسی وسعید من منصور وابن عدی فی الکامل)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : قیامت کے دن سب سے زیادہ سخت عذاب اس عالم کا ہوگا جس کو اللہ نے اس کے علم سے فائدہ نہیں پہونچایا ۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم : مررت لیلۃ اُسری بی باقوام تقرض شفاھھم بمقارض من نار ۔ فقلت من انتم ۔ قالوا کنا نامر بالخیر ولا نأتیہ وننھی عن الشر ونأتیہ (رواہ ابن حبان)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : معراج کی رات میرا گزر ایسے لوگوں سے ہوا جن کے ہونٹ آگ کی قینچی سے کاٹے جا رہے تھے ۔ میں نے کہا کہ تم کون لوگ ہو ۔ انھوں نے کہا کہ ہم بھلائی کی تلقین کرتے تھے مگر خود بھلائی پر عمل نہیں کرتے تھے اور ہم برائی سے روکتے تھے مگر ہم خود برائی سے نہیں رکتے تھے ۔

وکان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول : اللھم انی اعوذ بک من علم لا ینفع وقلب لا یخشع وعمل لا یرفع ودعاء لا یسمع (رواہ الحاکم من حدیث ابن مسعود)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا فرمایا کرتے تھے : اے اللہ ، میں تجھ سے ایسے علم سے پناہ مانگتا ہوں جو نفع نہ دے اور ایسے دل سے جو ڈرتا نہ ہو اور ایسے عمل سے جو تیری طرف اٹھایا نہ جائے اور ایسی دعا سے جو سنی نہ جائے ۔

افراد کی اہمیت

آدمی پر لازم ہے کہ وہ ہمیشہ صحیح مقصد کو اپنائے۔ جو شخص صحیح مقصد کو اپنی زندگی کا مقصد بنائے گا وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اجر پائے گا۔ اور جو شخص غلط مقصد کو اپنی زندگی کا مقصد بنائے وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں پکڑا جائے گا اور اپنی بے راہ روی کے مطابق اس کی سزا پائے گا۔

تاہم موجودہ دنیا میں کامیابی کے لیے مقصد کا صحیح ہونا کافی نہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ مقصد کے گرد جو افراد اکٹھا ہوں وہ جاندار افراد ہوں۔ بے جان افراد نہ صحیح مقصد کو کامیاب بنا سکتے اور نہ غلط مقصد کو۔

افراد کے جاندار ہونے کے بہت سے پہلو ہیں۔ اس کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ وہ اپنے کردار سے اپنے آپ کو قابل اعتماد ثابت کریں۔ کسی شخص کو جو اختیار سونپا جائے اس اختیار میں وہ صحیح معنوں میں امانت دار ثابت ہو۔ جاندار افراد کی خاص صفت امانت ہے اور بے جان افراد کی خاص صفت خیانت۔

مثال کے طور پر ہجرت کے آٹھویں سال وہ حالات پیدا ہوئے جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کے ساتھ مدینہ سے مکہ کی طرف اقدام فرمایا۔ حضرت عبداللہ بن عباس بتاتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ۱۰ رمضان ۸ھ کو مدینہ سے مکہ کے سفر پر روانہ ہوئے۔ اس وقت آپ نے مدینہ میں اپنی جگہ پر کلثوم بن حصین کو حاکم مقرر کیا (ثم مضی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لسفرہ، واستخلف علی المدینۃ ابارُھم کلثومَ ابن حُصین بن عتبۃ بن خلف الغفاری، ابن ہشام جلد رابع صفحہ ۱۷)

اس کے بعد جب مکہ فتح ہو گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں عمرہ ادا فرمایا اور ذوالقعدہ ۸ھ میں مدینہ کے لیے واپس روانہ ہوئے۔ اس وقت آپ نے اپنی جگہ پر عتاب بن اُسید کو مکہ کا حاکم مقرر کیا (فلما فرغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من عمرتہ انصرف راجعًا الی المدینۃ واستخلف عَتّاب بن اُسید علی مکۃ، ابن ہشام جلد رابع صفحہ ۱۴۸)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی غیر موجودگی میں مدینہ کا انتظام دیکھنے کے لیے کلثوم بن حصین پر بھروسہ کرنا پڑا۔ اسی طرح مکہ کے انتظام کے لیے آپ نے عتاب بن اُسید پر بھروسہ کیا۔ اب غور کیجیے کہ اگر یہ

دونوں صاحبان بے جان اور بے بھروسہ افراد ہوتے تو کیا ہوتا۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جب مدینہ سے سفر کرکے مکہ پہونچتے تو آپ کو یہ خبر ملتی کہ کلثوم بن حصین نے بغاوت کرکے مدینہ میں اپنی آزاد حکومت قائم کرلی ہے۔ اسی طرح مکہ سے نکل کر جب آپ مدینہ کے لیے روانہ ہوتے تو راستہ میں کوئی خبر دینے والا آپ کو بتاتا کہ عتاب بن اسید نے آپ کی غیر موجودگی میں بغاوت کردی اور مکہ میں اپنی آزاد حکومت قائم کرلی۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اصحاب نے ایک ایسا انقلاب برپا کیا جس نے انسانی تاریخ کے رُخ کو موڑ دیا۔ ایسا اس لیے ہوا کہ آپ کے اصحاب بے حد جاندار لوگ تھے۔ اس کے برعکس اگر وہ بے جان لوگ ہوتے تو تاریخ میں ہمیں صرف باہمی لڑائیوں کے واقعات پڑھنے کو ملتے نہ کہ فتح و نصرت کے واقعات۔

جب بھی کوئی بڑا کام کرنا ہو تو اس کے لیے ہمیشہ بہت سے لوگوں کی مشترکہ جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے بڑا کام کوئی ایک آدمی کبھی انجام نہیں دے سکتا۔ اجتماعیت اور تنظیم کی اہمیت اسی لیے ہے تاکہ بڑے بڑے کام انجام دیے جاسکیں۔ زندگی سے اجتماعیت اور تنظیم کو حذف کردیجئے تو تمام بڑے کام بھی اسی کے ساتھ حذف ہو جائیں گے۔

جب بہت سے لوگ مل کر کوئی کام انجام دیں تو مختلف لوگوں کو مختلف ذمہ داریاں سونپی جاتی ہیں۔ کسی کو ایک چیز حوالے کی جاتی ہے اور کسی کو دوسری چیز۔ اس طرح تقسیم عمل کا نظام وجود میں آتا ہے۔ ایسے نظام کی کامیابی کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ ہر آدمی امانت دار ثابت ہو۔ جس کو جو چیز سونپی جائے وہ اس میں صحیح تصرف کرے، اور اس کے معاملہ میں اپنی ذمہ داریوں کو صحیح طور پر ادا کرے۔

اس کے برعکس اگر یہ ہو کہ اجتماعی نظام کی طرف سے جس کو جو چیز دی جائے اس کو وہ اپنی ذاتی ملکیت سمجھ لے، وہ اپنے فرائض کو ادا کرنے کے بجائے اپنے حقوق کو مستحکم کرنے میں اپنی ساری توجہ صرف کرنے لگے تو اجتماعی نظم کا اصل مقصد فوت ہو جائے گا۔ لوگ چھوٹے چھوٹے جھگڑوں میں الجھ کر رہ جائیں گے اور بڑے کام کے لیے جو منصوبہ بنایا گیا تھا۔ وہ اپنی تکمیل کو نہیں پہونچ سکے گا۔

زندہ افراد زندہ تاریخ بنالیتے ہیں اور مردہ افراد مردہ تاریخ۔

عورت کے بارہ میں

اسلام کی بنیاد دو باتوں پر ہے ——— اللہ کا خوف اور انسانوں کا احترام۔ اس کا حکم دیتے ہوئے قرآن میں ارشاد ہوا ہے :

یاایھا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدۃ وخلق منھا زوجھا وبث منھما رجالاً کثیراً ونساء۔ واتقوا اللہ الذی تساءلون بہ والارحام ان اللہ کان علیکم رقیبا (النساء ۱)

اے لوگو، اپنے رب سے ڈرو۔ جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا۔ اور اسی (کی جنس) سے اس کا جوڑا پیدا کیا۔ اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورت پھیلا دیئے۔ اور تم اللہ سے ڈرو جس کے واسطہ سے تم ایک دوسرے سے مانگتے ہو۔ اور قرابتوں کے باب میں بھی۔ بے شک اللہ تمہارے اوپر نگراں ہے۔

اس آیت میں خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا (خدا نے اس سے اس کا جوڑا پیدا کیا) کا مطلب بعض لوگوں نے یہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے آدم کو مٹی سے پیدا کیا، اور اس کے بعد ان کے جسم سے ان کی ایک پسلی نکال کر ان کی بیوی حوا کو بنایا۔ مگر یہ تشریح صحیح نہیں، یہ بائبل کی بات ہے نہ کہ قرآن کی بات۔

بائبل میں حضرت حوا کی پیدائش کے بارہ میں اسی قسم کی روایت آئی ہے۔ یہاں ہم بائبل کے الفاظ نقل کرتے ہیں :

اور خداوند خدا نے آدم پر گہری نیند بھیجی اور وہ سو گیا۔ اور اس نے اس کی پسلیوں میں سے ایک کو نکال لیا اور اس کی جگہ گوشت بھر دیا۔ اور خداوند خدا اس پسلی سے جو اس نے آدم میں سے نکالی تھی۔ ایک عورت بنا کر اسے آدم کے پاس لایا۔ اور آدم نے کہا کہ یہ تو اب میری ہڈیوں میں سے ہڈی اور میرے گوشت میں سے گوشت ہے۔ اس لیے وہ ناری کہلائے گی۔ کیوں کہ وہ نر سے نکالی گئی ہے۔ (پیدائش ۲ : ۲۱ — ۲۳)

بائبل کی یہی روایت ہے جس کو بعد کے کچھ لوگوں نے قرآن کی تفسیر میں داخل کر دیا۔ اور اس کی روشنی میں قرآنی آیت کی تشریح کرنے لگے۔ مگر یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ بائبل ایک محرف کتاب

ہے۔ اس میں پیغمبروں کے کلام کے ساتھ عام انسانی کلام کی آمیزش ہوئی ہے، اس لیے اس کے بیان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ اس کی روشنی میں قرآنی آیت کی تشریح کرنا درست ہے۔

قرآن کی مذکورہ آیت یا کسی بھی دوسری آیت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حوا کو آدم کی پسلی سے پیدا کیا گیا۔ قرآن کی مذکورہ آیت میں جو لفظ ہے وہ منہا (اس سے) ہے نہ کہ من ضلع آدم (آدم کی پسلی سے)۔ چنانچہ محقق مفسرین نے منہا سے مراد من جنسہا لیا ہے۔ یعنی نفس واحدہ (آدم) کی جنس سے نہ یہ کہ خود آدم کے اپنے جسم سے۔ ابو مسلم اصفہانی اور بعض دوسرے مفسرین سے یہی قول نقل ہوا ہے اور یہی قرآنی الفاظ کے مطابق ہے۔ (القول الثانی ماھو اختیار ابی مسلم الاصفہانی ان المراد من قولہ وخلق منہا زوجہا ای من جنسہا، تفسیر کبیر۔ ویحتمل ان یکون المعنی من جنسہ لا من نفسہ حقیقۃ، البحر المحیط)

منہا کو من جنسہا کے معنی میں لینے کی تائید بعض دوسری آیتوں سے ہوتی ہے۔ قرآن میں نفس کا لفظ بار بار جنس کے معنی میں آیا ہے۔ اس طرح یہ دوسری آیتیں سورہ نساء کی مذکورہ آیت کی نہایت واضح تشریح کر رہی ہیں۔ یہاں ہم چند آیتیں نقل کرتے ہیں:

واللہ جعل لکم من انفسکم ازواجا (النحل ۷۲) — اور اللہ نے تم ہی میں سے تمہارے لیے بیویاں بنائیں۔

ومن آیاتہ ان خلق لکم من انفسکم ازواجا لتسکنوا الیہا (الروم ۲۱) — اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تم ہی میں سے بیویاں بنائیں تاکہ تم سکون حاصل کرو۔

فاطر السماوات والارض جعل لکم من انفسکم ازواجا ومن الانعام ازواجا (الشوریٰ ۱۱) — وہ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔ اس نے تمہارے لیے تم ہی میں سے جوڑے بنائے اور اسی طرح مویشیوں میں سے جوڑے بنائے۔

ان آیتوں پر غور کیجیے۔ ان میں عام مردوں کی ازواج (بیویوں) کے لیے بھی عین وہی لفظ آیا ہے جو سورۂ نساء کی آیت میں حضرت آدم کی زوج (بیوی) کے لیے آیا ہے۔ اس کے مطابق حوا کو جس طرح آدم کی "نفس" سے پیدا کیا گیا۔ اسی طرح دوسرے تمام مردوں کی بابت بھی ارشاد ہوا ہے کہ

ان کی بیویوں کو ان کے "انفس" سے پیدا کیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ ان دوسری آیتوں کے یہ معنی نہیں لیے جا سکتے کہ ہر مرد کی بیوی اس کے اپنے جسم کے اندر سے نکالی گئی ہے۔ یہاں لازمی طور اس کو جنس کے معنی میں لینا ہوگا۔ یعنی یہ کہ اللہ نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے تمہاری عورتیں بنائیں تاکہ وہ تمہارے لیے حقیقی معنوں میں رفیق زندگی بن سکیں۔

جس طرح عام آدمیوں کی بیویاں ان کی ہم جنس ہیں نہ کہ حیاتیاتی معنوں میں ان کے جسم کا حصہ۔ اسی طرح حضرت آدم کی بیوی (حوا) بھی ان کی ہم جنس تھیں، وہ آدم کے جسم کے اندر سے نکالی نہیں گئیں، اللہ نے آدم کی طرح ان کی بیوی کو بھی اپنی قدرت سے پیدا کیا۔ جس طرح اس نے عام مردوں کی طرح ان کی عورتوں کو اپنی قدرتِ خاص سے پیدا فرمایا ہے۔

احادیث

اب ایک سوال ان احادیث کا ہے جو اس سلسلہ میں نقل کی جاتی ہیں اور جن میں صراحۃً ضلع (پسلی) کا لفظ آیا ہے۔ اس سلسلے میں پہلی بات یہ ہے کہ ان احادیث میں آدم وحوا کی تخلیق کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ بلکہ وہ عام عورتوں کے بارہ میں ہیں۔ یعنی ان احادیث میں ہر ہر عورت کی تخلیقی نوعیت کا ذکر ہے نہ کہ مخصوص طور پر حضرت حوا کی تخلیقی نوعیت کا ذکر۔ ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں:

استوصوا بالنساء خیرا فانھا خلقت من ضلع (التفسیر المظہری)

عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ کیوں کہ وہ پسلی سے پیدا کی گئی ہیں۔

اس کا یہ مطلب نہیں لیا جا سکتا کہ عورت واقعۃً پسلی سے پیدا کی گئی ہے۔ کیوں کہ پورے فقرہ کے ساتھ اس کا کوئی جوڑ نہیں۔ حدیث کا مدعا عورتوں کے ساتھ اچھے سلوک کی تاکید کرنا ہے۔ اس لیے اس کی وہی تشریح درست ہوگی جو اس اصل مدعا کے ساتھ مطابقت رکھتی ہو۔

"عورتیں پسلی سے پیدا کی گئی ہیں" کا فقرہ یہاں مجازی معنوں میں ہے نہ کہ حقیقی معنوں میں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عورتوں کا معاملہ پسلی جیسا معاملہ ہے۔ وہ پسلی کی مانند ہیں۔ چنانچہ دوسری روایت میں خود حدیث میں یہ صراحت موجود ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

عن ابی ھریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: المرأۃ کالضلع ان اقمتھا کسرتھا (بخاری، کتاب النکاح۔ مسلم، کتاب الرضاع)

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ عورت پسلی کی مانند ہے۔ اگر تم اس کو سیدھا کروگے تو تم اس کو توڑ دو گے۔

بخاری و مسلم کی اس روایت میں واضح طور پر کالضلع کا لفظ ہے۔ یعنی یہ کہ عورت پسلی کی مانند ہے نہ یہ کہ وہ خود پسلی سے بنائی گئی ہے۔ پسلی کی مانند ہونے کا مطلب کیا ہے، یہ بھی صراحتہً حدیث میں موجود ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ اگر تم اس کو سیدھا کرنے کی کوشش کروگے تو تم اس کو توڑ دوگے۔

"عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے" اور "عورت پسلی کی مانند ہے" دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ یہ صرف ادبی اسلوب کا فرق ہے نہ کہ حقیقت کا فرق۔ ہر زبان میں یہ اسلوب عام ہے کہ جب تشبیہ میں شدت پیدا کرنا مقصود ہو تو "مثل" کا لفظ حذف کر دیتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص کی بہادری بتانے کے لیے کبھی کہا جاتا ہے کہ وہ شیر کی طرح ہے۔ اور جب اس بات کو زیادہ زور دے کر کہنا ہو تو کہہ دیتے ہیں کہ "وہ شیر ہے"۔ جیسے میر انیس نے کربلا کے میدان کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہا ہے:

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے

عورت کے بارہ میں نفسیات اور حیاتیات کا علم بتاتا ہے کہ وہ "صنف نازک" ہے۔ وہ مرد کے مقابلہ میں کمزور اور نازک ہوتی ہے۔ اس کے مزاج میں انفعالیت ہے۔ چنانچہ کسی واقعہ سے وہ بہت جلد متاثر ہو جاتی ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کو ہر آدمی جانتا ہے خواہ وہ پڑھا لکھا ہو یا بے پڑھا لکھا۔ ہر باپ جانتا ہے کہ بیٹے سے سختی کی جا سکتی ہے مگر بیٹی کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرنا ضروری ہے۔ کیوں کہ وہ شدت کا تحمل نہیں کر سکتی۔ چنانچہ خودکشی کے اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ مردوں کے مقابلہ میں عورتیں زیادہ خودکشی کرتی ہیں، وہ ایک معمولی واقعہ سے متاثر ہو کر خودکشی کر سکتی ہیں یا ذہنی اختلال کا شکار ہو کر رہ جاتی ہیں۔

یہی وہ معلوم حقیقت ہے جس کو حدیث میں تمثیل کے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ آدمی کے

سینے میں پسلی کی ہڈیاں کسی قدر خم دار ہوتی ہیں۔ ان کا خم دار رہنا ہی مصلحت کے مطابق ہے۔ کوئی ڈاکٹر ایسا نہیں کرتا کہ آپریشن کے ذریعہ ان پسلیوں کو سیدھا کرنے کی کوشش کرے۔

اسی معلوم واقعہ کی مثال دیتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورتوں کے ساتھ ان کی فطرت کے مطابق پیش آؤ۔ عورتوں سے معاملہ کرتے ہوئے ہمیشہ یہ ذہن میں رکھو کہ عورتیں فطری طور پر نازک اور جذباتی ہوتی ہیں۔ اللہ نے مخصوص مصالح کے تحت انھیں بالارادہ ایسا ہی بنایا ہے اس لیے تم ان کے ساتھ ہمیشہ نرم برتاؤ کرو۔ کوئی بات بتانا ہو تو نرمی اور خوش اسلوبی کے ساتھ بتاؤ اگر تم ان کے ساتھ سختی کروگے تو ان کی شخصیت اس کا تحمل نہ کرسکے گی۔ ان کا دل اسی طرح ٹوٹ جائے گا جس طرح پسلی سیدھا کرنے میں ٹوٹ جاتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار سفر میں تھے۔ کچھ خواتین اونٹ پر بیٹھی ہوئی چل رہی تھیں ساربان نے اونٹ کو زیادہ تیز چلانا چاہا۔ اونٹ جب تیز چلتا ہے تو مسافر کا جسم کافی ہلنے لگتا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ساربان کو منع کیا اور فرمایا: رفقا بالقواریر (شیشہ کے برتنوں کے ساتھ نرمی کرو)۔

جدید تحقیقات

موجودہ زمانہ میں خالص علمی طور پر یہ بات تسلیم کرلی گئی ہے کہ مرد اور عورت کے درمیان بنیادی پیدائشی فرق پائے جاتے ہیں، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) میں خواتین کی حالت (Status of women) پر ایک مفصل مقالہ ہے۔ اس مقالہ کا ایک ذیلی عنوان یہ ہے:

Scientific studies of male-female differences

(مرد اور عورت کے فرق کا علمی مطالعہ) مقالہ کے اس حصہ میں مقالہ نگار نے دکھایا ہے کہ جدید تحقیقات ثابت کرتی ہیں کہ عورت اور مرد کے درمیان عین پیدائشی بناوٹ کے اعتبار سے فرق پایا جاتا ہے اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:

> With respect to personality traits, men are characterized by greater aggressiveness, dominance, and achievement motivation, women by greater dependency, a stronger social orientation, and the tendency to be more easily discouraged by failure than men (19/907).

اوصافِ شخصیت کے اعتبار سے، آدمیوں کے اندر جارحیت اور غلبہ کی خصوصیت زیادہ پائی گئی ہے۔ ان میں حاصل کرنے کا جذبہ بھی زیادہ ہوتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں عورتیں سہارا چاہتی ہیں۔ ان کے اندر معاشرہ پسندی کا رجحان زیادہ ہوتا ہے۔ اور ناکامی کی صورت میں مردوں کے مقابلہ میں وہ زیادہ آسانی سے بے ہمت ہوجاتی ہیں۔

اس سلسلہ میں موجودہ زمانہ میں بے شمار تجربات کیے گیے ہیں۔ مثلاً امریکہ میں ایک تجربہ یہ کیا گیا کہ ایک لڑکا اور ایک لڑکی کا انتخاب کیا گیا۔ دونوں کم عمر تھے۔ اور ابھی بولنے کی عمر کو نہیں پہونچے تھے۔ تاہم ان کی جسمانی صحت یکساں تھی۔ ان کو دو الگ الگ کٹہرے میں رکھ کر نکلنے کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ اس کے بعد لڑکی رونے چلانے لگی، جب کہ لڑکے نے اِدھر اُدھر ہاتھ مار کر اندازہ کرنا شروع کیا کہ کیا کسی طرف سے وہ نکلنے کا راستہ پا سکتا ہے۔

اسی طرح ایک تجربہ میں پایا گیا کہ بارہ ماہ کی لڑکیاں کسی اجنبی کمرہ میں ہوں اور انھیں خوفزدہ کیا جائے تو وہ اپنی ماؤں کی طرف بھاگتی ہیں جب کہ اسی عمر کے لڑکے کچھ کرنے کی راہ ڈھونڈنے لگتے ہیں نیویارک یونیورسٹی میں ریسرچ کرنے والوں نے دیکھا کہ ایک لڑکی اگر بوتل پینے میں مشغول ہے تو وہ اس وقت پینے سے رک جاتی ہے جب کہ کوئی شخص کمرے میں آتا ہوا نظر آئے۔ اس کے برعکس ایک لڑکا کسی آنے والے پر کوئی دھیان نہیں دیتا وہ اپنا کام بدستور جاری رکھتا ہے۔

ماہرین نے بتایا ہے کہ عورت اور مرد کے تمام فرق ان کے جین کے اندر پائے جاتے ہیں نہ کہ سماجی حالات میں۔ عورتوں کے اندر انفعالیت کا سبب ان کے مخصوص ہارمون ہیں۔ میل ہارمون اور فیمیل ہارمون میں یہ فرق پیدائش کے بالکل آغاز سے موجود رہتا ہے۔ (ٹائم میگزین، نیویارک، ۲۰ مارچ ۱۹۷۲)

اسلام دین فطرت ہے۔ اس کے تمام احکام فطری حقیقتوں پر مبنی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فطری تقاضوں کو قانونی صورت دینے ہی کا دوسرا نام شریعت ہے۔ عورت کے بارے میں اسلام کی تعلیمات بھی اسی بنیادی اصول پر مبنی ہیں۔ نفسیات اور حیاتیات اور عصویات میں موجودہ زمانہ میں جو تحقیقات ہوئی ہیں وہ ثابت کرتی ہیں کہ مرد کے مقابلہ میں عورتیں فطری طور پر منفعل مزاج ہوتی ہیں۔ مخصوص معاشرتی مصالح کی بنا پر خالق نے ان کو نسبتاً نازک پیدا کیا ہے۔

یہی وہ فطری حقیقت ہے جس کی رعایت اسلامی تعلیمات میں رکھی گئی ہے۔ اس بنا پر اسلامی شریعت میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ عورتوں کے ساتھ نرمی کا سلوک کرو تاکہ وہ بے حوصلہ نہ ہوں، تاکہ وہ دل شکنی سے محفوظ رہیں اور زندگی میں اپنے مخصوص فرائض کو بخوبی طور پر ادا کر سکیں۔ عورتیں لوہے کی مانند نہیں ہیں کہ ان پر ٹھونک پیٹ کا کوئی اثر نہ پڑے، وہ پسلی کی مانند ہیں۔ وہ فطرۃً جیسی ہیں ویسی ہی انھیں رہنے دو۔ اگر تم ان کے ساتھ لوہے جیسا برتاؤ کروگے تو تم ان کی شخصیت کو توڑ دوگے۔

خلاصہ

سورہ نساء کی آیت (خلق منھا زوجھا) کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے جس جنس سے آدم کو بنایا، اسی جنس سے اس نے آدم کے جوڑے (حوا) کو بھی بنایا تاکہ دونوں میں موافقت رہے۔ اگر ایسا ہوتا کہ دونوں دو الگ الگ جنس ہوتے، مثلاً ایک آگ سے بنایا جاتا اور دوسرا مٹی سے، تو دونوں کے درمیان باہمی توافق نہ ہوتا۔ پھر نہ خاندانی زندگی میں سکون پایا جاتا اور نہ یہ ممکن ہوتا کہ دونوں مل کر مشترکہ جدوجہد سے تمدن کی تعمیر کریں۔

حدیث (ضلع) میں عورتوں کے بارے میں جو بات ارشاد ہوئی ہے اس کا مقصد تمثیل کی زبان میں یہ بتانا ہے کہ عورتوں کی مخصوص فطری ساخت کی بنا پر ضروری ہے کہ ان کے ساتھ نرمی کا سلوک کیا جائے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار مختلف انداز سے یہ نصیحت فرمائی ہے اور خود اپنی پوری زندگی میں اس کا مکمل اہتمام کیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عورتیں رات کی نمازوں میں شریک ہوتی تھیں۔ بعض اوقات ان کے ساتھ ان کے چھوٹے بچے بھی ہوتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ نماز کی اقامت کا بہت خاص اہتمام فرماتے تھے، لیکن خواتین کے ساتھ آپ کی رعایت کا یہ حال تھا کہ نماز میں اگر کبھی چھوٹے بچے کے رونے کی آواز آجاتی تو آپ نماز کو جلد ختم کر دیتے۔ حدیث میں آیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

انی لاقوم فی الصلوٰۃ اریدان اطول فیھا فاسمع بکاء الصبیّ فاتجوز فی صلاتی کراھیۃ ان اشق علیٰ اُمّہ

(بخاری، کتاب الصلوٰۃ)

میں مسجد میں نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہوں، یہ چاہتا ہوں کہ اس کو لمبا کروں، پھر میں بچہ کے رونے کی آواز سنتا ہوں تو میں اپنی نماز کو مختصر کر دیتا ہوں، اس اندیشہ کی بنا پر کہ میں اس کی ماں کو تکلیف دوں گا۔

حرص اور قناعت

پاکستان کے ڈاکٹر جاوید نے لکھا ہے کہ وہ امریکہ گئے۔ وہاں وہ ایک کروڑ پتی سے ملے۔ کروڑ پتی نے ان کو اپنے ایک خاص مکان میں ملاقات کے بلایا۔ یہ مکان سمندر کے کنارے بنا ہوا تھا۔ جدید طرز کا وسیع مکان، اس کے آگے شاندار لان، اس کے آگے حد نظر تک پھیلی ہوئی سمندر کی لہریں۔ چاروں طرف عیش اور خوبصورتی کے مناظر۔ اس ماحول میں مہمان اور میزبان دونوں مکان کے سامنے لان میں کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔

ڈاکٹر جاوید کہتے ہیں کہ میں اس ماحول میں گم تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ میں جنت کی دنیا میں بیٹھا ہوا ہوں۔ مجھ پر محویت کا عالم طاری تھا۔ امریکی کروڑ پتی بھی چپ چاپ کسی سوچ میں مبتلا تھا۔ اچانک امریکی نے میری طرف مخاطب ہوتے ہوئے کہا: مسٹر جاوید، میں چاہتا ہوں کہ امریکہ کو چھوڑ کر پاکستان چلا جاؤں اور زندگی کے بقیہ دن وہیں گزاروں۔

"کیوں" ڈاکٹر جاوید نے حیرت کے ساتھ پوچھا۔

"یہ سب چیزیں مجھے کاٹتی ہیں۔ مجھے ایک منٹ کے لیے بھی سکون حاصل نہیں"

یہ واقعہ دنیا کی حقیقت کو بتا رہا ہے۔ دنیا کا حال یہ ہے کہ جو شخص پائے ہوئے نہ ہو وہ سمجھتا ہے کہ پانے کا نام خوشی ہے۔ مگر جو شخص پائے وہ محسوس کرتا ہے کہ پاکر بھی اسے خوشی حاصل نہیں ہوئی۔ سب کچھ پاکر بھی اس نے خوشی کو نہیں پایا۔

حقیقت یہ ہے کہ زندگی نام ہے چاہی ہوئی چیز کو نہ پانے کا۔ جو لوگ اس راز کو جان لیں وہ نہ ملنے پر بھی اس طرح مطمئن رہتے ہیں جیسے کہ انھوں نے سب کچھ پا لیا ہو۔ اور جو لوگ اس راز کو نہ جانیں وہ ہمیشہ اپنی چاہی ہوئی چیز کو پانے کا خواب دیکھتے رہتے ہیں اور کبھی بھی اس کو نہیں پاتے۔ کیونکہ پانے کے بعد جلد ہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ وہ چیز نہیں جس کو انھوں نے پانا چاہا تھا۔ وہ ایک نہ ملنے والی چیز کے غم میں پڑے رہتے ہیں، یہاں تک کہ اسی حال میں مر جاتے ہیں۔

مذہب کی اصطلاح میں پہلی چیز کا نام قناعت ہے اور دوسری چیز کا نام حرص۔ انھیں دو لفظوں میں زندگی کی ساری کہانی چھپی ہوئی ہے۔

بے چین روح

بلیر فاولر (پیدائش ۱۹۲۱) امریکہ کے ایک راکٹ انجینیر ہیں۔ وہ اعلیٰ قابلیت کے ان انجینیروں میں شامل تھے جن کی کوششوں نے آخر کار سیٹرن راکٹ کی تشکیل اختیار کی۔ جنوری ۱۹۸۶ میں بلیر فاولر چند دن کے لیے نئی دہلی آئے۔ یہاں انھوں نے تاج پیلس (ہوٹل) میں ہندستان ٹائمس کے نمائندہ سے بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ ان کی زندگی اب ایک مکمل تبدیلی سے دوچار ہو چکی ہے۔ ان کی بیوی ایک کامیاب میڈیکل ڈاکٹر تھیں۔ اور وہ خود اپنے کیریر کی چوٹی پر پہونچ چکے تھے کہ دس سال پہلے دونوں نے اپنا اپنا کام یک لخت چھوڑ دیا۔

اس کے بعد وہ دونوں شہر سے باہر کیلی فونیا کے ایک معمولی فارم میں چلے گیے۔ یہاں وہ دونوں بالکل سادہ قدیم دیہاتی انداز میں زندگی گزارتے ہیں۔ وہ اپنے ہاتھ سے لکڑی کاٹتے ہیں۔ لکڑی کی آگ پر خود اپنے ہاتھ سے کھانا پکاتے ہیں۔ وہ مشینی دنیا سے بھاگ کر فطرت کی دنیا میں زندگی گزار رہے ہیں اور اپنی اس سادہ زندگی پر بالکل خوش ہیں۔ انھوں نے کیوں ایسا کیا۔ مسٹر بلیر فاولر کے الفاظ میں، اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ ہمارا علم جتنا ترقی کرتا ہے اتنا ہی ہم کو اپنی جہالت کا احساس ہوتا ہے:

As our knowledge grows the more one
gets convinced that he is ignorant.

انھوں نے علم کی دنیا میں اپنا سفر شروع کیا تھا۔ مگر آخر کار انھیں معلوم ہوا کہ ان کا ہر اگلا قدم صرف جہالت کی طرف بڑھ رہا ہے۔ انسانی علم آدمی کو حقیقی علم تک نہیں پہونچاتا۔

مزید یہ کہ مذکورہ سائنسی ماحول میں ان کو روحانی سکون حاصل نہ تھا۔ بلیر فاولر کو ایک ایسے احاطہ میں کام کرنا پڑتا تھا جس کے چاروں طرف چار فیٹ کی مضبوط دیواریں کھڑی ہوئی تھیں۔ ان کا کام یہ تھا کہ ہائیڈروجن گیس کو رقیق ہائیڈروجن میں تبدیل کریں۔ اس کے لیے بڑے سخت حالات میں کام کرنا پڑتا ہے۔ نیز ہر وقت یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ گیس کا ذخیرہ پھٹ نہ جائے۔ یہ صورت حال ایک مستقل ذہنی تناؤ کا باعث بنی رہتی ہے

حقیقت یہ ہے کہ خدا سے کمتر کوئی چیز انسان کو سکون عطا نہیں کر سکتی۔ خواہ وہ سائنسی علوم ہوں یا مادی اور مشینی ترقیاں۔

Total change

NEW DELHI, Jan. 27 — "As our knowledge grows the more one gets convinced that he is ignorant" says Blair Fowler, an aero-jet engineer who worked on the first liquid propulsion rocket in the United States that ultimately became the Saturn rocket with several million pounds thrust.

On a brief holiday in India, Mr. Fowler told this correspondent at the Taj Palace, New Delhi that his life had now undergone a total change. At the peak of his career ten years ago he and his wife, who too had a prosperous medical practice, simply gave up their jobs and money and retired to a Californian ranch "to work with our bare hands"

Mr Fowler holds out his hands, now toughened and also rough by physical work like wood cutting, carpentry, blacksmithy, etc. "When I was in the rocket propulsion group my hands had become soft through constant paper work designing and redesigning."

At 65, Mr Fowler looks quite young and strong. "We do a lot of wood cutting for firewood in our home which is heated by log fire". There is a furnace and forge also in his ranch where he hammers iron into shape like the blacksmiths used to do in the olden days.

Looking back at the development in rocketry which now has put a man on the moon and done several extraordinary things, this aero-engineer recalls the way they worked to develop the liquid hydrogen and oxygen burning rocket motor under Theodore Von Carman, a well known rocket expert.

There were no electronic instruments at that time even though they had to work with pumps with speeds of 40,000 rpm. Kryogenics, the science of supercooling, was still in its infancy. How liquid hydrogen and oxygen would behave was also not known.

They worked behind three feet concrete walls and lived in constant fear of explosion. In fact there was one such explosion "but we escaped". To obtain even a few litres of liquid hydrogen, repeated cooling using liquid nitrogen and dripping techniques under high vacuums had to be utilised. "We learnt later that the Soviet scientist Kapista was also developing these engines parallely." Subsequently, Mr Fowler worked on nuclear rocket development but the project was given up as unpracticable.

Why did he and his wife give up their practice and money to go back to ranch life? He says: "Though we were quite well off, we were not living, each one busy in his own work. We did not have time to talk to each other. Today we are a happy couple as we share our work. My wife kneads the dough and bakes the bread and we have much time for mutual communication".

Mr Fowler is very much influenced by Gandhian thinking like hard physical work and its elevating nature, the need for man to be self-sufficient and simple living. He thinks that there is lot of sense in that philosophy.

The Hindustan Times, January 28, 1986

صحیح اندازِ کار

دوسری جنگ عظیم میں جرمنی کے مقابلہ میں فرانس کو شکست ہوئی۔ اس دوران پیرس میں ایک میٹنگ ہوئی جس میں فرانس کے مختلف ذمہ دار شریک تھے۔ اس میٹنگ میں جن لوگوں نے تقریریں کیں ان سب کا مشترک خلاصہ یہ تھا کہ ہر ایک جرمنی کو اور نازی پارٹی کو برا بھلا کہتا رہا۔ آخر میں ایک فرانسیسی جنرل اٹھا اس نے کہا کہ ہماری شکست کا سبب جرمنی نہیں بلکہ ہم خود ہیں۔ اور وہ یہ کہ ہمارے پاس نہ ہتھیار ہیں اور نہ لڑنے والے جوان :

No armament, no children

دوسری جنگ عظیم سے پہلے فرانس کی جنگی صنعت نسبتاً بہت پیچھے تھی۔ دوسری طرف فرانس میں جنسی اباحیت کے نتیجہ میں بہت بڑے پیمانہ پر یہ ذہن پیدا ہو گیا تھا کہ بچے نہ پیدا کیے جائیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرانس میں بچوں کی پیدائش کی شرح بہت گھٹ گئی۔ مذکورہ جنرل کے نزدیک یہ دو داخلی اسباب تھے جو فرانس کے شکست کا سبب بنے۔ ظاہر ہے کہ جب نہ ہتھیار ہو اور نہ فوج تو جنگ کیسے لڑی جائے گی۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ معاملات میں سوچنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک ہے خارجی اندازِ فکر اور دوسرا ہے داخلی اندازِ فکر۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے اندر احیاءِ امت کی جو تحریکیں چل رہی ہیں وہ سب کی سب خارجی اندازِ فکر پر چل رہی ہیں۔ ہر ایک نے اپنے سے باہر ایک "دشمن" دریافت کر رکھا ہے۔ اور ہر ایک اپنے دریافت کردہ دشمن کے خلاف تقریری یا غیر تقریری مہم چلانے میں مصروف ہے۔

موجودہ زمانہ کی مسلم تحریکوں میں اس اعتبار سے غالباً ایک ہی استثناء ہے اور وہ تبلیغی جماعت کا ہے تبلیغی جماعت واحد مسلم جماعت ہے جو داخلی اندازِ فکر پر چل رہی ہے۔ تبلیغی جماعت کا کہنا یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر ایمان و یقین کی کمزوری سے ان کے سارے مسائل پیدا ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کے اندر اگر دوبارہ ایمان و یقین زندہ ہو جائے تو ان کے تمام مسائل بھی اپنے آپ حل ہو جائیں گے۔

راقم الحروف ذاتی طور پر اسی آخری طرزِ فکر کو صحیح سمجھتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں کا ہر مسئلہ ان کی داخلی کمزوری کا مسئلہ ہے۔ جو شخص واقعۃً کوئی نتیجہ خیز کام کرنا چاہتا ہو اس کو مسلمانوں کی داخلی اصلاح پر اپنی ساری طاقت لگا دینی چاہیے۔

خدا کی سنّت

قرآن میں حضرت موسیٰ اور فرعون کا قصہ بیان ہوا ہے۔ بتایا گیا ہے کہ فرعون نے حق کو قبول نہیں کیا۔ اس نے اس کے مقابلے میں سرکشی دکھائی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سمندر میں غرق کر دیا گیا۔

اس سلسلہ میں ارشاد ہوا ہے کہ فرعون اور اس کی قوم نے کتنے ہی باغ اور چشمے اور کھیتیاں اور آرام دہ مکانات اور عیش کے سامان جن میں وہ خوش رہتے تھے چھوڑ دیئے۔ اللہ مجرموں کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کرتا ہے۔ اور ان چیزوں کا وارث اللہ نے دوسروں (بنی اسرائیل) کو بنا دیا۔ پس نہ ان پر آسمان رویا اور نہ زمین اور نہ انھیں مہلت مل سکی۔ اور اللہ نے بنی اسرائیل کو ذلت کے عذاب سے نجات دی یعنی فرعون سے۔ بے شک وہ سرکش اور حد سے نکل جانے والا تھا۔ اور اللہ نے بنی اسرائیل کو دنیا والوں پر ترجیح دی۔ اللہ نے ایسا اپنے علم کی بنا پر کیا اور ان کو ایسی نشانیاں دیں جن میں کھلا ہوا انعام تھا۔ (الدّخان ۲۵-۳۳)

اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں ایک قوم کا گرنا اور دوسری قوم کا ابھرنا اتفاقی طور پر نہیں ہوتا۔ اور نہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک قوم اپنی ظالمانہ کارروائیوں سے دوسری قوم کے اوپر غالب آگئی۔ یہ تمام تر خدا کے علم کے تحت ہوتا ہے۔ یہ خدا ہے جو خود اپنے فیصلہ کی بنا پر ایک کے لیے مغلوبیت کا اور دوسرے کے لیے غلبہ کا فیصلہ کرتا ہے۔ اور یہ فیصلہ اس استحقاق کی بنا پر ہوتا ہے جو کسی قوم نے علمِ الٰہی کے مطابق اپنے لیے ثابت کیا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں جب ایک قوم غالب اور دوسری قوم مغلوب ہو جائے تو دونوں کو چاہیے کہ اس واقعہ کو وہ خدا کی طرف منسوب کریں نہ کہ کسی اور کی طرف۔ اگر یہ ذہن ہو تو دونوں صحیح راستہ پر قائم رہیں گے۔ غالب قوم اپنے غلبہ پر خدا کا شکر ادا کرے گی نہ کہ وہ غلبہ کو اپنا کارنامہ سمجھ کر فخر اور گھمنڈ میں مبتلا ہو جائے۔

دوسری طرف مغلوب قوم اگر مغلوب ہونے کے بعد غالب قوم کے خلاف شکایت اور احتجاج کی مہم شروع کر دے تو یہ اس کے لیے سراسر ایک غلط فعل ہوگا۔ کیوں کہ غالب قوم خدا کے علم اور فیصلہ سے غالب ہوئی ہے نہ کہ محض اپنی سازشوں یا جارحانہ کارروائیوں کی وجہ سے اس نے غلبہ پایا ہے۔ ایسی حالت میں مغلوب

قوم کے کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ وہ اپنی ان اندرونی خامیوں کو دور کرے جس کی وجہ سے وہ خدا کی نظر میں بے استحقاق ثابت ہوئی ہے۔ وہ خدا کی طرف متوجہ ہو نہ کہ مفروضہ ظالموں کی طرف۔ جب اصل کرنے والا خدا ہے تو دوسروں کے خلاف ہنگامہ کرنے سے کیا فائدہ۔

یہ بات سادہ معنوں میں محض توجیہہ کی بات نہیں ہے بلکہ یہ وہ بات ہے جس پر قوموں کا مستقبل بنتا ہے۔ یہی وہ بات ہے جس پر قوموں کے مستقبل کا فیصلہ ہوتا ہے۔

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ صحیح ذہن سے صحیح منصوبہ بندی وجود میں آتی ہے۔ اور اگر ذہن غلط ہو تو منصوبہ بندی بھی غلط ہو جائے گی۔ مسلمانوں کی جدید تاریخ اس کی نہایت واضح اور عبرت ناک مثال پیش کرتی ہے۔

جدید دور میں مسلمان ساری دنیا میں غیر مسلم قوموں سے مغلوب ہو گیے۔ کہیں براہ راست طور پر مسلمانوں کے اوپر غیر مسلم قوموں کا غلبہ قائم ہو گیا اور کہیں بالواسطہ طور پر۔ بیسویں صدی کے نصف آخر میں اکثر ملکوں میں غیر مسلم اقوام کا براہ راست غلبہ بظاہر ختم ہو گیا ہے۔ تاہم ان کا بالواسطہ غلبہ بدستور مزید شدت کے ساتھ باقی ہے۔

اس صورت حال کے پیش آنے کے بعد مسلمانوں نے کیا کیا۔ ساری دنیا میں مسلمانوں نے اس کے جواب میں ایک ہی کام کیا ہے۔ اور وہ ہے غیر مسلم اقوام کے خلاف چیخ پکار، یا ان سے ٹکراؤ۔ تاہم ایک صدی سے بھی زیادہ مدت کا تجربہ بتاتا ہے کہ مسلمانوں کی لفظی چیخ پکار فضا میں گم ہو گئی اور ان کی ٹکراؤ کی سیاست آخر کار صرف مزید بربادی پر ختم ہوئی۔ مسلمانوں کو ان کی پرشور کوششوں کا اتنا بھی فائدہ حاصل نہیں ہوا جتنا انھوں نے اپنے بچے ہوئے اثاثہ میں سے اس کی راہ میں خرچ کیا تھا۔

اس کی واحد وجہ وہی ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا۔ یعنی غلط ذہن کی وجہ سے غلط منصوبہ بندی۔ مسلمانوں نے موجودہ زمانہ میں غیر مسلم اقوام کے غلبہ کو صرف اس نظر سے دیکھا کہ یہ کچھ ظالم لوگ ہیں جو اپنی سازشوں اور جارحانہ کارروائیوں کے ذریعہ مسلمانوں کے اوپر غالب آگیے ہیں۔ انھوں نے اس واقعہ کو خود غالب قوموں کا معاملہ سمجھا نہ کہ خدا کا معاملہ، جیسا کہ قرآن میں بتایا گیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی ساری توجہ غالب اقوام کے خلاف جھوٹی چیخ پکار اور جھوٹی لڑائیوں میں صرف ہو گئی۔

اس کے برعکس اگر موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا ذہن قرآن کی روشنی میں بنا ہوتا تو وہ سمجھتے کہ

جو کچھ ہوا ہے وہ خدا کے علم اور خدا کے فیصلہ کے تحت ہوا ہے۔ یہ خود خدا ہے (نہ کہ کوئی قوم) جس نے موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کو مغلوب کرکے دوسری قوموں کو ان کے اوپر غالب کر دیا ہے۔ اگر مسلمانوں کے اندر یہ ذہن ہوتا تو وہ قوموں کی طرف دوڑنے کے بجائے خدا کی طرف دوڑتے۔ وہ دوسروں کے خلاف چیخ پکار کرنے کے بجائے اپنی اندرونی اصلاح پر سارا زور لگا دیتے۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا کی نظر میں بے استحقاق ہونے کی وجہ سے مسلمان مغلوب کیے گئے تھے۔ اور خدا کی نظر میں استحقاق ثابت کرکے ہی وہ دوبارہ غالب حیثیت حاصل کر سکتے تھے۔ مگر مسلمان بروقت اس راز کو سمجھ نہ سکے۔ ایسے لوگوں کے لیے یہی مقدر ہے کہ وہ خدا کی دنیا میں پست اور بے قیمت ہو کر رہ جائیں۔

قابلِ توجہ

اگر آپ نے الرسالہ کو صرف ایک بار پڑھا

تو آپ نے الرسالہ کو نہیں پڑھا۔

اگر آپ الرسالہ کو پسند کرتے ہیں مگر آپ اس کو پھیلانے کی کوشش نہیں کرتے

تو ابھی آپ الرسالہ کو پسند کرنے والے نہیں بنے۔

الرسالہ کو بار بار پڑھیے، الرسالہ کو دوسروں میں پھیلائیے۔

اس کے بعد ہی آپ وہ حق ادا کر سکتے ہیں جو الرسالہ جیسے جریدہ کا آپ

کے اوپر عاید ہوتا ہے۔

نیویارک کی ایک سڑک سے ہم رات کے وقت گزر رہے تھے۔ وہاں ایک روشن اشتہار نظر آیا۔ یہ جاپانی کار ٹویوٹا کا اشتہار تھا۔ یہ اشتہار انتہائی کامیاب اور انتہائی خوبصورت انداز میں بنایا گیا تھا۔ نیویارک کی سڑکوں پر امریکی کاروں (بیوک، فورڈ وغیرہ) کے اشتہار بھی نظر آئے مگر وہ جاپانی اشتہار کے مقابلہ میں بہت پھیکے تھے۔ امریکی اشتہار محض اوسط درجہ کے اشتہار تھے جب کہ جاپانی اشتہار آرٹ کا بہترین نمونہ تھا۔

اسی طرح اقوام متحدہ میں ہم نے دیکھا کہ وہاں آنے والے زائرین کی رہنمائی کے لیے بہت سی خاتون گائڈ مقرر ہیں۔ ہماری جماعت کے لیے جو گائڈ متعین کی گئی وہ ایک جاپانی لڑکی تھی۔ وہ اس قدر سرگرم تھی اور اس قدر کامیابی کے ساتھ شستہ انگریزی میں تمام چیزوں کا تعارف کرا رہی تھی کہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ انسان ہے یا کوئی مشین۔ جاپانی لوگوں کی یہ عام خصوصیت ہے کہ وہ جس کام کو کرتے ہیں اس کو اعلیٰ ترین معیار پر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور جن لوگوں کے اندر یہ مزاج پیدا ہو جائے انھیں کوئی چیز موجودہ دنیا میں کامیاب ہونے سے روک نہیں سکتی۔ خواہ قدرتی عطیات میں وہ سب سے کم ہوں، خواہ بموں کی بارش سے انھیں کھنڈر بنا دیا گیا ہو۔

ہوٹل کی ایک منزل پر ایک خوبصورت بورڈ لگا ہوا تھا جس پر جلی حرفوں میں لکھا ہوا تھا :

Assembly of the World's Religions
BOOK DISPLAY

یہاں نہایت سلیقہ کے ساتھ مختلف مذہبی کتابوں کی نمائش کی گئی تھی۔ اس میں اسلامی مرکز کی اردو، عربی، اور انگریزی مطبوعات بھی رکھی گئی تھیں۔ بعض غیر مسلم صاحبان نے اس نمائش میں اسلامی مرکز کی کتابیں دیکھیں تو اس کے بعد وہ ہم سے ملے اور کتابوں کو حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کی۔

افریقہ، امریکہ، یورپ سے آئے ہوئے مسلمانوں کو انگریزی الرسالہ دکھایا گیا۔ انھوں نے اس کو بہت پسند کیا۔ یہ لوگ ان علاقوں میں جو دعوتی کام کر رہے ہیں اس کے لیے انھیں موزوں لٹریچر نہیں ملتا۔ انھوں نے کہا کہ الرسالہ ہمارے دعوتی کام میں زبردست مددگار ثابت ہوگا۔

ایک صاحب کینیا سے آئے تھے جو وہاں کی یونیورسٹی میں اسلامیات کے پروفیسر ہیں اور

دعوتی کام بھی کرتے ہیں۔ ان کا نام (Badru Dungu Kateregga) ہے۔ انھوں نے انگریزی الرسالہ لیا اور بیٹھے بیٹھے اس کے چند مضامین اسی وقت پڑھ ڈالے اس کے بعد ان کی زبان سے بے اختیار نکلا :

You are doing a wonderful work

ایک امریکی نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ وہ نیویارک کے ایک یہودی خاندان میں پیدا ہوئے۔ اس کے بعد انھوں نے اسلام قبول کرلیا۔ ان کا موجودہ نام (Ya-sin Andy Gold) یاسین اینڈی گولڈ ہے۔ وہ پانچ سال سے باقاعدہ مسلمان ہیں اور اب نیو میکسکو میں رہتے ہیں۔ ان کو انگریزی الرسالہ دیا گیا تھا۔ اس کو انھوں نے رات کو پڑھ لیا۔ اگلے دن ملاقات ہوئی تو انھوں نے انگریزی الرسالہ کے بارہ میں غیر معمولی تاثر کا اظہار کیا۔ ان کا تاثر ان کے اپنے الفاظ میں یہاں نقل کیا جاتا ہے :

I have read two issues of Al-Risala (English) and am very grateful for having been introduced with this publication. The work comes I believe from a place of deep understanding and is written in a way that is particularly appropriate for westerners. Not only is the language itself clear, but the thoughts are phrased in such a way as to be understood by those of us with a western conceptual frame-work. The articles are very much to the point, the meanings available on a number of levels.

Ya-Sin Andy Gold, Lama Foundation, P.O. Box 240,
San Cristobal, New Mexico 87564, U.S.A.

میں نے الرسالہ انگریزی کے دو شمارے پڑھے۔ میں بہت خوش ہوں کہ مجھے ایسی مطبوعات سے متعارف ہونے کا موقع ملا۔ میرا یقین ہے کہ یہ مضامین بہت گہری معرفت سے نکلے ہیں اور وہ اس طرح لکھے گیے ہیں جو خاص طور پر اہل مغرب کے لیے بہت موزوں ہے۔ نہ صرف یہ کہ ان کی زبان بہت صاف ہے بلکہ خیالات اس طرح تحریر کیے گیے ہیں کہ ہمارے جیسے لوگوں کے لیے قابل فہم ہیں جن کا ذہنی سانچہ مغرب میں بنا ہے۔ مضامین بالکل دو ٹوک انداز میں ہیں۔ ان کے معانی میں بڑی وسعت پائی جاتی ہے۔

یہ ان بہت سے تاثرات میں سے صرف چند ہیں جو اس موقع پر مسلمانوں اور غیر مسلموں

کی طرف سے سامنے آئے۔

اس موقع پر ہر مذہب کو عبادت کے لیے ہال دیئے گئے تھے۔ چنانچہ ایک ہال "مسجد" کے لیے بھی تھا۔ کانفرنس میں مختلف ملکوں کے تقریباً ۸۰ مسلمان شریک تھے۔ ان کی ایک قابلِ لحاظ تعداد نماز کے وقت مسجد میں جمع ہو جاتی۔ ان حضرات نے اپنے اپنے حلقہ میں ہونے والے مباحثہ کی رپورٹ دیتے ہوئے ایک بات مشترک طور پر کہی۔ وہ یہ کہ دوسرے مذاہب پر گفتگو کے وقت لوگ سنجیدہ رہتے ہیں۔ مگر جہاں اسلام کا ذکر آیا وہ جارحانہ انداز اختیار کر لیتے ہیں۔ خود ہمارے حلقۂ بحث میں بھی یہ صورت پیش آئی۔ تاہم میرا خیال ہے کہ اس کی ذمہ داری دوسروں سے زیادہ خود مسلمانوں پر ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے اسلام کا تعارف زیادہ تر سیاسی انداز سے کرایا ہے۔ اگر اسلام کا تعارف فطری انداز میں کرایا جائے تو اس قسم کا ردِ عمل اپنے آپ ختم ہو جائے گا۔

ایک مجلس میں میں نے دیکھا کہ ایک مسلمان پروفیسر نے اسلام کو "ایک کامل ریاستی نظام" کے طور پر پیش کیا۔ اس کے بعد غیر مسلم حاضرین نے فوراً پاکستان، ایران، عراق اور دوسرے ملکوں کی مثالیں دے کر کہنا شروع کیا کہ وہاں ایسا اور ایسا ہو رہا ہے تو کیا اسلام کا ریاستی نظام یہی ہے۔ پھر جب منفی ذہن پیدا ہوا تو اس کے بعد دوسرے غیر متعلق اعتراضات بھی شروع ہو گئے جیسا کہ ہمیشہ ہوتا ہے۔ اس کا واحد حل یہ ہے کہ اسلام کو آخرت کے انداز میں پیش کیا جائے نہ کہ سیاست اور حکومت کے انداز میں، جیسا کہ وہ فی الواقع ہے۔

آدمی ہمیشہ نظریہ کی تصدیق (Verification) چاہتا ہے۔ جب آپ اسلام کا تعارف سیاسی نظام کے انداز میں کرائیں تو قدرتی طور پر وہ اس کی تصدیق کے لیے موجودہ مسلم ملکوں کو دیکھتا ہے۔ اور جب ان ملکوں میں وہ کوئی بہتر نظام نہیں پاتا تو وہ اس کی صداقت کے بارہ میں شک میں پڑ جاتا ہے۔ اس کے برعکس جب آپ اسلام کا تعارف فطرت کے انداز میں کرائیں تو آدمی اس کی تصدیق کے لیے انسانی فطرت کو دیکھتا ہے اور یہاں وہ فوراً اس کی تصدیق پا لیتا ہے۔ کیوں کہ انسانی فطرت کا خالق خدا ہے اور اس نے اس کو سراسر حق کی بنیاد پر بنایا ہے۔ فطرت کے انداز میں پیش کیا ہوا اسلام خود آدمی کے اپنے دل کی سطح پر بلا تاخیر اپنی تصدیق پا رہا ہے۔ جب کہ

سیاسی نظام کے انداز میں پیش کیا ہوا اسلام کہیں بھی اپنی تصدیق نہیں پاتا۔

مسلم شرکاء اور دوسرے مذاہب کے شرکاء نے بطور خود بھی کچھ اجتماعات کیے۔ مثلاً مسلمانوں نے عام شرکاء کو دعوت دی کہ وہ مسجد میں آئیں اور اسلام کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اس کے مطابق ۱۹ نومبر کو "مسجد" میں ایک اجتماع ہوا۔ بعض مسلمانوں نے ابتداءً مختصر تقریر کی۔ اس کے بعد سوال و جواب ہوئے۔ مگر محسوس ہوا کہ اس طرح کے اجتماع کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ پیشگی طور پر ذہن بنایا جا چکا ہو۔ مثلاً یہاں اجتماع ہوا تو مسلمانوں نے آپس کے اختلافی مسائل پر بحث شروع کر دی۔ اس کا اثر اچھا نہیں پڑا اور کئی غیر مسلم شرکاء درمیان میں اٹھ کر چلے گئے۔ آپس کے اختلاف پر گفتگو کا مقام آپس کی ملاقاتیں ہیں نہ کہ مشترک اجتماعات۔

ایک بات یہودی نمائندوں کے سلسلہ میں ہے۔ اکثر بنیادی مسائل میں مسلم نقطۂ نظر اور یہودی نقطۂ نظر تقریباً ایک رہتا تھا (مثلاً یہ کہ اخلاق اصولی طور پر ایک خدائی حکم ہے) اس کی وجہ یہ تھی کہ تمام تحریف کے باوجود آج بھی بائبل اور قرآن میں بہت سے امور میں مشابہت پائی جاتی ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ یہودی ہی وہ قوم ہیں جو اسلام اور مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ مذہب جب قوم بن جائے تو ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔ اس کے بعد قوم برتر حیثیت حاصل کر لیتی ہے اور مذہب اس کا تابع بن کر رہ جاتا ہے۔

عیسائی پادری (Paulos Mar Gregorios) نے ۱۹ نومبر کو (Christian heritage) عیسائی ورثہ پر تقریر کی۔ انھوں نے بتایا کہ "اسمبلی" کے نمائندے ان کے استقبال کے لیے آدھ گھنٹہ تاخیر سے ایرپورٹ پہونچے۔ انھوں نے بتایا کہ جب میں نے ایرپورٹ پر کسی کو نہیں دیکھا تو میں پبلک ٹیلیفون پر گیا کہ اسمبلی کے ذمہ داروں سے ربط قائم کروں اور اپنا بیگ اور سامان باہر چھوڑ دیا۔ ٹیلی فون کر کے واپس آیا تو میں اپنا سامان کھو چکا تھا۔ اس بیگ میں موصوف کی تیار شدہ تقریر بھی شامل تھی۔ یہ بات انھوں نے عام اجتماع میں اپنی تقریر کے آغاز میں کہی۔

یہ واقعہ نیویارک ہوائی اڈہ پر ہوا۔ اسی طرح اور واقعات معلوم ہوئے جس سے اندازہ ہوا کہ امریکہ اب اخلاقی تنزل کی طرف جانا شروع ہو گیا ہے۔ ایک انجینیر پندرہ سال سے امریکہ میں رہتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ۷۰-۱۹ میں جو مکان ۲۰ ہزار ڈالر میں بہ آسانی مل جاتا تھا۔ اس کو حاصل

کرنے کے لیے اب ڈیڑھ لاکھ ڈالر دینا پڑتا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ پچھلے دس برسوں میں بہت تیزی سے امریکہ میں افراط زر (Inflation) ہوا ہے۔ ہر چیز کی قیمتیں بڑھ گئی ہیں۔ مگر اسی نسبت سے لوگوں کی آمدنیاں نہیں بڑھی ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ شروع میں جب میں امریکہ آیا تو ہر طرف خوش حالی نظر آتی تھی۔ اب وہ خوش حالی نظر نہیں آتی۔ اس مہنگائی سے اخلاقی تنزلی آنا شروع ہو گیا ہے۔ چوری، رشوت، مکان کی پگڑی، اس طرح کی چیزیں پہلے عام امریکی زندگی میں مطلق نہیں تھیں۔ مگر اب اس طرح کی مثالیں (اگرچہ بہت کم) سامنے آنا شروع ہو گئی ہیں۔

امریکہ میں افراط زر (مہنگائی) ویٹ نام کی جنگ کے زمانہ میں شروع ہوئی۔ اس کے بعد امریکہ کے خلائی پروگرام (خلائی ہتھیاروں کے تجربات) نے اس کو بہت بڑھا دیا۔ خلائی پروگرام بے پناہ مہنگے ہوتے ہیں۔ حتی کہ امریکہ بھی اپنی ساری دولت کے باوجود ان کا تحمل نہیں کر سکتا۔ اس کی قیمت اس کو بڑھتی ہوئی مہنگائی کی صورت میں ادا کرنی پڑتی ہے۔ خلائی پروگرام کی مہنگائی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ امریکہ ایک اسپیس اسٹیشن بنا رہا ہے جو ۱۹۹۰ میں مکمل ہوگا۔ اس خلائی اسٹیشن پر امریکی حکومت کو گیارہ بلین ڈالر خرچ کرنے ہوں گے۔ یہ اسٹیشن زمین سے ۲۳ ہزار میل اوپر قائم ہوگا۔ اسٹار وارس پروگرام میں صرف ریسرچ پر ۲۶ بلین ڈالر خرچ ہوں گے۔

ایک یہودی نوجوان (Shlomo Biderman) اسرائیل سے آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے کہا کہ یہودی مذہب میں سب سے زیادہ زور توحید پر ہے اور سب سے زیادہ غلط چیز بت پرستی ہے۔ حتی کہ یہودی کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ جو شخص بت پرستی کے خلاف ہو وہ یہودی ہے:

One who is against idolatory is a Jew

یہ بات صحیح ہے کہ یہودی قوم میں پتھر کے بتوں کو پوجنے کا رواج نہیں۔ مگر یہود نے یہودی نسل کو جو مقام دیا ہے وہ خود ایک قسم کی بت پرستی ہے۔ وہ پتھر کے بت نہ پوجنے پر فخر کرتے ہیں۔ مگر عین اسی وقت وہ قوم کے بت کو پوج رہے ہیں۔ یہی تضاد مختلف شکلوں میں خود مسلمانوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بتوں اور قبروں کو نہ پوجنے والے بھی غیر اللہ کے پرستار ہوتے ہیں۔ مگر کسی کو اس واقعہ کی خبر نہیں۔

مسٹر ایرک (Erik Hoogearspel) نیدرلینڈ سے آئے تھے۔ وہ عیسائی خاندان میں پیدا

ہوئے۔ اس کے بعد ذاتی مطالعہ سے بدھسٹ ہوگیے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ بدھ لوگ خدا کو نہیں مانتے کیا آپ بھی خدا کو نہیں مانتے۔ انھوں نے کہا ہاں۔ میں خدا کو نہیں مانتا۔ میں نے کہا کیوں۔ انھوں نے کہا اس لیے کہ خدا کو ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے کہا کہ اگر خدا کے وجود کا عقلی ثبوت نہ ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ حقیقۃً بھی خدا کا وجود نہیں۔ اس کی وجہ ہماری کمیاں (Limitations) ہیں۔ ہم اپنی کمیوں کی وجہ سے کسی بھی چیز کو عقلی طور پر ثابت نہیں کر سکتے۔ پھر جس طرح دوسری چیزیں قرینہ کی بنیاد پر مانی جاتی ہے اسی طرح خدا کو بھی قرائن کی بنیاد پر ماننے میں کیا رکاوٹ ہے۔

جب میں نے دیکھا کہ منطقی دلیل سے وہ قائل نہیں ہو رہے ہیں تو میں نے کہا کہ میں اپنے بارہ میں کہہ سکتا ہوں کہ خدا میری ذاتی دریافت ہے۔ میں اپنی دریافت (Realization) کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ مجھے خدا کے بارہ میں کوئی شک نہیں۔ جب میں نے اس طرح یقین کی زبان میں کہا تو میں نے دیکھا کہ وہ نرم ہوگیے۔ اس کے بعد ان کا زور کلام ٹھنڈا پڑ گیا۔ شاید بیشتر انسانوں کا حال یہ ہے کہ وہ استدلال سے زیادہ یقین سے متاثر ہوتے ہیں۔

نیوجرسی اور نیویارک میں کافی مسلمان آباد ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگوں سے ملاقات ہوئی انھوں نے زور دیا کہ آپ کانفرنس سے فراغت کے بعد مزید کم از کم ایک مہینہ ہمارے پاس ٹھہریے یہاں ہم مختلف مقامات پر لوگوں کو جمع کریں گے جن کے سامنے آپ اپنا دینی پیغام رکھ سکیں۔ مگر میرے لیے ٹھہرنے کا موقع نہیں تھا اس لیے ان لوگوں سے معذرت کر دی۔ تاہم جناب مرزا فرید بیگ صاحب (نیوکلیر انجینیر) کے اصرار پر مجھے ایک دن مزید ٹھہرنا پڑا۔ مرزا فرید بیگ نہایت صالح اور ذہین نوجوان ہیں۔ دینی امور کے سختی سے پابند ہیں۔ چہرے پر نمایاں داڑھی بھی موجود ہے۔

۲۰ نومبر ۱۹۸۵ کی شام کو ہم نے ہوٹل چھوڑ دیا اور مرزا فرید بیگ صاحب کے ساتھ لینڈنگ (نیوجرسی) کے لیے روانہ ہوئے۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ سفر کرنے کے بعد ہم فرید بیگ صاحب کے مکان پر پہونچے۔ میں نے دیکھا کہ جیسے ہی گاڑی گیرج کے سامنے پہونچی گیرج کا دروازہ اوپر اٹھنا شروع ہوگیا۔ یہاں تک کہ پورا دروازہ اٹھ گیا اور گاڑی اندر داخل ہوگئی۔ دروازہ کا یہ کھلنا ریموٹ کنٹرول کے ذریعہ ہوا۔ یہ دروازہ شٹر کی مانند بنایا جاتا ہے تاکہ وہ لپیٹا جا سکے۔

دروازہ سے ملا ہوا ایک خاص طرح کا موٹر ہوتا ہے۔ یہ موٹر وائرلیس لہروں کے ذریعہ کنٹرول ہوتا ہے مرزا فرید بیگ کے ہاتھ میں سگریٹ لائٹر کی مانند ایک چیز تھی۔ انھوں نے اس کو میرے ہاتھ میں دیا۔ اس سے کوئی تار وغیرہ وابستہ نہ تھا۔ میں نے اس کا بٹن دبایا تو دروازہ اپنے آپ شٹر کی مانند اوپر اٹھنا شروع ہو گیا یہاں تک کہ پورا دروازہ اوپر چلا گیا۔ پھر میں نے دوبارہ بٹن دبایا تو دروازہ نیچے آنے لگا۔ یہاں کہ وہ پوری طرح بند ہو گیا۔

اس کو آج کل کی زبان میں ریموٹ کنٹرول سسٹم کہتے ہیں اور اس قسم کا ریموٹ کنٹرول امریکی زندگی میں عام ہو چکا ہے۔ آپ اپنے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا مشینی ڈبہ لے کر اس کے ذریعہ سے ٹیلی وژن کھول اور بند کر سکتے ہیں۔ ٹیلی فون کو ہاتھ سے چھوئے بغیر ربط قائم کر سکتے ہیں۔ گھر کی روشنی کو دور سے جلا یا بجھا سکتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ

۲۰ نومبر کو ہوٹل چھوڑتے وقت ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ کانفرنس کے ذمہ داروں نے ہمارے ہر قسم کے خرچ کی ذمہ داری لی تھی۔ مگر ٹیلی فون کے خرچ کی ذمہ داری خود ہمارے اوپر تھی۔ ہم کو ہوٹل سے دہلی میں اور خود امریکہ میں کچھ ٹیلی فون کرنے پڑے۔ روانگی کے وقت جب ہوٹل کے دفتر سے حساب مانگا گیا تو انھوں نے کہا کہ آپ کا حساب ادا شدہ ہے۔ ان سے بار بار کہا گیا کہ ہم نے تو ادا نہیں کیا پھر وہ کیسے ادا ہو گیا۔ انھوں نے کہا کہ نہیں، ہمارا کمپیوٹر یہی بتاتا ہے کہ آپ کا حساب ادا ہو گیا ہے۔ ہمارے اصرار پر انھوں نے کمپیوٹر کا بٹن دبایا اور ایک کاغذ چھپ کر سامنے آگیا جس میں ہمارے نام کے ساتھ تقریباً چودہ ڈالر کا بل تھا اور وہ پورا ادا شدہ تھا۔ ہم نے کہا کہ ہم نے یہ رقم ادا نہیں کی ہے اس لیے آپ کمپیوٹر کے اس حساب کے باوجود ہم سے یہ رقم لے لیں مگر وہ لینے پر راضی نہیں ہوئے۔ ایسا کیوں کر ہوا، یہ ایک معمہ تھا جس کا کوئی جواب نہ ہمارے پاس تھا اور نہ ہوٹل والوں کے پاس۔ کمپیوٹر کا یہ کاغذ ہمارے پاس موجود ہے۔

مرزا فرید بیگ صاحب کے ساتھ ایک دن گزار کر ہم ۲۱ نومبر ۱۹۸۵ کی شام کو ایرپورٹ کے لیے روانہ ہوئے۔ راستہ میں بوٹن (Boonton) کی مسجد میں مغرب کی نماز پڑھی۔ یہ مسجد بہت خوبصورت اور دو منزلہ ہے۔ ایرپورٹ پہونچے تو ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ ہمارے پاس کتابوں کا ایک بنڈل تھا۔ اس کو پلاسٹک کی رسی سے باندھا گیا تھا۔ ہم کینڈی ایرپورٹ

میں داخل ہوئے تو چیکنگ کے ذمہ داروں نے اس کو کاٹنے کے لیے قینچی نکالی۔ میں بہت گھبرایا کہ اگر انھوں نے رسی کاٹ ڈالی تو یہاں ایرپورٹ پر دوسری رسی باندھنے کے لیے کہاں ملے گی۔ ہم نے ان کو منع کیا مگر وہ نہیں مانے، انھوں نے کہا، آپ گھبرائیے نہیں۔ ہم اس کو کاٹنے کے بعد دوبارہ ٹیپ کر دیں گے۔ چنانچہ انھوں نے رسی کاٹ کر پھینک دی اور اس کو دیکھنے کے بعد دوبارہ اوپر سے کافی مقدار میں ٹیپ لگا کر پہلے سے زیادہ بہتر پیک کر دیا۔

مجھے یاد آیا کہ اسی قسم کا واقعہ یکم مارچ ۱۹۸۴ کو میرے ساتھ ایک مسلم ملک کے ایرپورٹ پر پیش آیا تھا۔ وہاں بھی ہمارے پاس کتابوں کا ایک بڑا پیکٹ تھا۔ چیکنگ کے عملہ نے اس کی رسیاں کاٹنے کے لیے قینچی نکالی۔ ہم نے بہت کہا کہ اس میں صرف دینی کتابیں ہیں اور کچھ نہیں۔ ہم نے یہ بھی کہا کہ آپ نے رسیاں کاٹ دیں تو اس کو دوبارہ باندھنا ہمارے لیے سخت مشکل ہوگا۔ مگر انھوں نے کچھ نہیں سنا اور ساری رسیاں کاٹ ڈالیں۔ اس کے بعد انھوں نے نہ پیکٹ میں دوبارہ ٹیپ لگایا اور نہ کسی دوسرے طریقے سے ہماری مدد کی۔ بڑی مشکل سے ہم نے رسیوں کو جوڑ جوڑ کر پیکٹ کو دوبارہ باندھا۔ کتنا فرق ہے ایک قوم اور دوسری قوم میں۔

امریکہ میں ہندستان اور پاکستان جیسے ملکوں کے بہت سے لوگ رہتے ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے یہاں کی شہریت بھی لے لی ہے۔ تاہم ان میں بہت کم ایسے لوگ ہیں جو یہاں کے سماج میں پوری طرح ضم ہو گیے ہوں۔

یہ لوگ بڑے عجیب عجیب مسائل سے دوچار ہیں۔ مثلاً اپنے ملکوں میں وہ عادی ہیں کہ وہ جس طرح چاہیں اپنے بچوں کی نگرانی کریں۔ حتی کہ وہ انھیں تنبیہ کر سکیں۔ مگر یہاں وہ اس سلسلہ میں اپنے آپ کو بے بس پاتے ہیں۔ یہاں کا ایک باپ اپنے بچے کو تنبیہ نہیں کر سکتا۔ اگر وہ تنبیہ کرے تو بچے کو یہ حق ہے کہ وہ اپنے باپ کے خلاف پولیس کو بلا سکے۔ یہاں پولیس کا ایک خاص دستہ مقرر ہے جس کا کام یہ ہے کہ وہ بچوں کو ستائے جانے سے بچائے۔ اس کو یہاں کی زبان میں "چائلڈ ابیوز" کہتے ہیں۔ اس کا ایک مخصوص ٹیلی فون نمبر ہے۔ کوئی بچہ اس نمبر پر رنگ کر کے فوراً اس کو اپنی مدد کے لیے بلا سکتا ہے۔ ایسے واقعات معلوم ہوئے کہ باپ نے بگڑ کر بچے کو مارنا چاہا تو بچے نے فوراً کہا:

Don't touch me. I will call Child Abuse.

یعنی مجھ کو چھونا مت ورنہ میں بچوں کی پولیس کو ٹیلی فون کر دوں گا۔

اس سفر میں آمد و رفت کو ملا کر دس دن گزرے۔ میرا یہ سفر گویا ساری دنیا کی طرف سفر تھا۔ اس سفر میں میں نے تقریباً دنیا کی ہر قوم کو دیکھا اور تقریباً ہر عقیدہ کے لوگوں کا تجربہ کیا۔ میرا آخری تاثر یہ تھا کہ موجودہ دنیا میں ہر چیز ہے مگر وہی ایک چیز نہیں جس کو انسانی فطرت سب سے زیادہ چاہتی ہے یعنی خدا کا سچا مذہب۔ مذہب کے جو اڈیشن مذہب کے نمائندوں کے پاس ہیں اور جس کو وہ لوگوں کے سامنے پیش کر رہے ہیں وہ سب کے سب بگڑے ہوئے مذہب ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ انسانی فطرت سے مطابقت نہیں کر پاتے۔

انسان ایک خدا چاہتا ہے اور مشرکانہ مذاہب اس کو کئی خداؤں کی عبادت کی طرف بلا رہے ہیں۔ انسان سادہ مذہب چاہتا ہے اور عیسائیت اس کو فلسفیانہ موشگافیوں والا مذہب دے رہی ہے۔ انسان اصولی مذہب چاہتا ہے اور یہودیت کے پاس انسان کو دینے کے لیے صرف نسلی مذہب ہے۔ انسان ایک برتر خدا کی تلاش میں ہے اور ہندوازم اس کو یقین دلا رہا ہے کہ تم خود اپنی ذات میں خدا ہو۔ انسان روحانی سطح پر خدا کو پانا چاہتا ہے اور مادی مذاہب اس کو سیاست اور حکومت کی سطح پر مذہب کا نسخہ پیش کر رہے ہیں۔

یہاں مسلمان جدید انسان کو رہنمائی دے سکتے تھے۔ کیوں کہ ان کے پاس سچا خدائی مذہب بالکل محفوظ حالت میں موجود ہے۔ مگر یہاں بھی یہ مشکل ہے کہ اصل اسلام تو صرف کتاب میں ہے۔ اور مسلمان عملاً جس مذہب کو لوگوں کے سامنے پیش کر رہے ہیں وہ ان کی اپنی تعبیرات ہیں جو انھوں نے اصل خدائی دین میں تصرف کر کے بنائی ہیں۔ اصل اسلام تو بلاشبہ انسانی فطرت کے عین مطابق ہے مگر جس تعبیری اسلام کی مسلمان آج نمائندگی کر رہے ہیں وہ انسانی فطرت کے مطابق نہیں۔ اس لیے خود اسلام اور انسانی فطرت کے درمیان بھی عملاً وہی عدم مطابقت پیدا ہو گئی ہے۔ جو دوسرے مذاہب اور انسانی فطرت کے درمیان پائی جاتی ہے۔

آج سب سے بڑا کام یہ ہے کہ اسلام کو کسی ملاوٹ کے بغیر اس کے حقیقی روپ میں انسان کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ اس کے بعد ساری انسانیت خدا کی رحمتوں کے سایہ میں آجائے گی۔

وما ذالک علی اللہ بعزیز۔

۱۶ نومبر ۱۹۸۵ کو سورج نہیں دکھائی دیا۔ کچھ دیر کے بعد میں نے کمرہ کے ایک طرف لگے ہوئے شیشہ سے باہر دیکھا تو ہر چیز سفید ہو رہی تھی۔ سڑکوں اور پارکوں میں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بے حد سفید قسم کے روئی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اوپر سے گر رہے ہیں اور سڑکوں اور پارکوں پر ان کا صاف و شفاف فرش بچھا ہوا ہے درخت بھی ان سے ڈھکے ہوئے نظر آتے تھے۔ معلوم ہوا کہ برف گر رہی ہے۔ تاہم یہ وہ برف نہ تھی جس کے لیے ہمارے یہاں برف یا اولہ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ یہ اسنو (Snow) تھی۔ چوں کہ ہندستان جیسے ملکوں میں اسنو نہیں گرتی اس لیے اردو زبان میں اس کے لیے کوئی لفظ بھی موجود نہیں۔ اس قسم کی اسنو میں نے پہلی بار روم میں اکتوبر ۱۹۷۶ میں دیکھی تھی اور دوسری بار ۱۶ نومبر ۱۹۸۵ کو نیوجرسی میں دیکھی۔

یہ اسنو سرد ملکوں کے لیے ایک عجیب نعمت ہے۔ یہاں کے کسان اسنو کے موسم سے کچھ پہلے زمین میں بیج بو دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کا انکھوا نکل آتا ہے۔ انکھوا نکلنے کے بعد جب اسنو گرتی ہے تو ان کے اوپر اس کی تہ جم جاتی ہے۔ اسنو چوں کہ روئی کی طرح بالکل نرم ہوتی ہے اس لیے وہ انکھوا کو نقصان نہیں پہونچاتی اس کے بعد اسنو دھیرے دھیرے پگھلنا شروع ہوتی ہے اور فصل کو آہستہ آہستہ پانی پہونچاتی ہے۔ یہ ایک عجیب قسم کی قدرتی آبپاشی ہے جو سرد ملکوں کے کسانوں کے لیے من و سلویٰ کی نعمت سے کم نہیں۔

ایک ہندستانی بزرگ امریکہ گیے۔ وہاں ایک روز انھوں نے ایک امریکی سے پوچھا: کیا آپ کے یہاں ملاوٹ کا دودھ (Adulterated Milk) بھی ملتا ہے۔ یہ سن کر امریکی کچھ دیر چپ رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا جواب دوں۔ کچھ دیر کے بعد وہ بولا: ہاں، ہمارے یہاں بعض اسٹور ملاوٹ کا دودھ بھی تیار کرتے ہیں۔ وہ قدرتی دودھ میں بعض وٹامن کا اضافہ کرتے ہیں تاکہ اس کی غذائیت کو بڑھا سکیں۔

مذکورہ عمل کو انگریزی میں (Adulteration) نہیں کہا جاتا۔ اس کو (Enrichment) کہتے ہیں۔ مگر امریکی ذہن چوں کہ اس تصور سے خالی تھا کہ دودھ میں پانی ملا دیا جائے اس لیے اس نے اڈلٹریشن کے لفظ کو (Enrichment) کے معنی میں لیا۔ کتنا فرق ہے ہندستان کے تاجر اور امریکہ کے تاجر میں۔

ڈاکٹر خورشید احمد صاحب سے ۱۷ نومبر کو تفصیلی ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ آپ کو اپنے مشن کا تسلسل جاری رکھنے کے لیے افراد تیار کرنا چاہیے۔ اس سلسلہ میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے سیرت سے متعلق ایک بات کہی جو انھیں کے اپنے الفاظ میں یہ تھی:

"حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر کارنامہ عظیم ہے۔ لیکن ایک پہلو جس پر غور کرنے کی ضرورت ہے

وہ یہ ہے کہ آپ نے صرف دور رسالت مآب ہی نہ دیا، جو ایک معیاری اور مثالی دور ہے۔ بلکہ ایسے انسان تیار کیے کہ خلافتِ راشدہ کا ادارہ وجود میں آیا جس کے بارہ میں خود آپ ہی نے فرمایا کہ علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین۔ اس طرح آپ نے ایک تاریخی عمل کا آغاز کیا جس نے مسلم تاریخ میں تسلسل (Continuity) قائم کیا۔ اور آپ نے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا ایک ایسا گروہ چھوڑا جس کے ذریعہ اسلام کی دولت اور حضور کی سنت دنیا کے گوشے گوشے تک پہونچ سکی۔"

ترکی کے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ استانبول یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ میں نے کہا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ کمال اتاترک ایک یہودی تھا۔ انھوں نے کہا کہ نسلی اعتبار سے تو یہ بات صحیح نہیں۔ مگر وہ ہمارے لیے عیسائیوں اور یہودیوں سے بھی زیادہ برا تھا۔ اس نے ترک قوم کو ذبح کر دیا۔ میں نے پوچھا کہ کیسے ذبح کیا۔ انھوں نے کہا کہ اس نے ہمارا رشتہ ہماری تاریخ سے کاٹ دیا۔ اور کسی قوم کے لیے اس سے بڑا کوئی ذبیحہ نہیں۔

ایک مغربی ملک کے ایک پروفیسر نے کہا کہ ہم نے سنا ہے کہ ہندستانی مسلمانوں کو بہت سی مشکلات ہیں۔ میں نے کہا کہ پھر کون سی قوم ہے جس کو مشکلات درپیش نہیں۔ میں نے کہا یہ صحیح ہے کہ ہندستانی مسلمانوں کو بعض مشکلات درپیش ہیں۔ مگر مشکل زندگی کی ایک حقیقت ہے۔ آپ کسی حال میں اس سے بچ نہیں سکتے صرف صورت کا فرق ہے۔ بنگلہ دیش اور پاکستان کو دیکھئے، ایران اور عراق کو دیکھئے۔ سعودی عرب اور لیبیا کو دیکھئے۔ سب کے درمیان مشکلات و مسائل ہیں۔ حالاں کہ یہ سب اسلامی ملک ہیں۔ مشکلات و مسائل کا تعلق مسلم اور غیر مسلم سے نہیں۔ جہاں صرف مسلمان ہی مسلمان ہوں وہاں مسلمانوں اور مسلمانوں کے درمیان مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ مسائل اس وقت تک ختم نہیں ہو سکتے جب تک موجودہ دنیا کا خاتمہ نہ ہو جائے۔ انھوں نے میرے نقطۂ نظر سے اتفاق کرتے ہوئے کہا، آپ صحیح کہتے ہیں :

We have to learn to live with problems
instead of protesting against them.

ایک سردار جی کناڈا سے آئے تھے۔ وہ تقریباً ۲۰ سال سے کناڈا میں رہ رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں نے قرآن کے کئی ترجمے دیکھے مگر کسی سے تسلی نہیں ہوئی۔ میں نے کہا کہ آپ صرف ترجمہ پڑھنا چاہتے ہیں یا اس کے ساتھ کمنٹری بھی۔ انھوں نے کہا کہ کمنٹری ہو تو اور بھی اچھا ہے۔ وہ چوں کہ اردو زبان بخوبی

جانتے تھے، ان کو تذکیر القرآن (جلد اول) پیش کی گئی وہ بہت خوش ہوئے ۔

ایک صاحب جو اپنے سفید فام حلیہ سے کسی مغربی ملک کے باشندہ معلوم ہوتے تھے۔ انھوں نے ملاقات کے وقت کہا :

What is your tradition?

اس جملہ کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ آپ کی روایت کیا ہے۔ مگر اردو استعمال کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ تھا کہ آپ کس مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں دین اور مذہب کے بارہ میں تصور یہ ہے کہ وہ ایک معاشرتی رواج ہے۔ اس کا ماخذ انسانی سماج ہے نہ کہ خدائی الہام۔ اسی کے مطابق تمام اصطلاحات بنی ہیں۔ اب مذہب کے بارے میں اس طرح کے الفاظ بولے جاتے ہیں :

Islamic heritage, Islamic tradition (اسلامی روایت، اسلامی ورثہ) اس طرح جدید انسان مذہب کو مان کر بھی مذہب کی نفی کر رہا ہے۔ مذہب اسی وقت مذہب ہے جب کہ وہ ایک خدائی حکم ہو۔ مذہب کو اگر سماجی ورثہ یا معاشرتی رواج قرار دیدیا جائے تو اس کی ساری اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی جو نیویارک کی ایک بڑی فرم میں نیوکلیر انجینیر ہیں۔ ان کو انگریزی الرسالہ دیا گیا۔ اس کو پڑھنے کے بعد انھوں نے کہا کہ آپ کا الرسالہ مجھ کو پسند آیا۔ مگر یہ بتائیے کہ آپ نے لکھنے کی یہ ٹکنک کہاں سیکھی۔ میں نے پوچھا کہ کون سی ٹکنک۔ انھوں نے کہا کہ چھوٹے چھوٹے اور ایک ایک صفحہ کے مضامین کی ٹکنک۔ انھوں نے بتایا کہ ہم لوگ اپنی فیلڈ میں ایسا ہی کرتے ہیں۔ ہم سے یہ کہا جاتا ہے کہ جب کوئی ڈاکومنٹ تیار کریں تو ہمیشہ کم سے کم الفاظ میں لکھیں تاکہ ہمارے اوپر کے لوگ کم سے کم وقت میں اس کو پڑھ سکیں۔

میں نے کہا کہ مجھ کو یہ ٹکنک میرے دعوتی درد نے سکھائی۔ میں اس بات کی تڑپ رکھتا ہوں کہ آج کے انسان تک حق کا پیغام پہونچاؤں۔ پھر میں دیکھتا ہوں کہ آج کا انسان اتنا مصروف ہے کہ وہ لمبا مضمون پڑھنے کے لیے تیار نہیں۔ اس لیے میں چھوٹے چھوٹے مضامین میں اپنی بات کہنے کی کوشش کرتا ہوں تاکہ آج کا انسان ان کو پڑھ سکے۔ اگر میں لمبے لمبے مضامین لکھوں تو آج کا انسان ان کو دیکھ کر رکھ دے گا اور میرا لکھنا بیکار ہوگا۔

امریکہ میں ایک طرف مادہ پرستی اپنے شباب پر ہے۔ دوسری طرف یہاں روحانیت کے مبلغین کی بھی کمی نہیں۔ اس سلسلہ میں ایک قابل ذکر ملاقات آرٹورو شمٹ (Artoro Schmidt) کی تھی۔

وہ ایک امریکی مبلغ ہیں۔ امریکہ میں ایک ادارہ ہے جس کا نام ہے :

International Temperance Association

یہ ادارہ شراب نوشی اور اس طرح کی دوسری چیزوں کے خلاف ہے۔ موصوف اس سلسلہ میں بہت سے ممالک کا دورہ کر چکے ہیں۔ وہ ہندستان بھی جا چکے ہیں ان سے بہت دیر تک اس موضوع پر گفتگو ہوئی۔

آخر میں میں نے کہا کہ آپ لوگ شراب نوشی کے خلاف جو مہم چلا رہے ہیں اس کا محرک مذہب ہے یا طبی تحقیقات۔ انھوں نے کہا کہ دونوں۔ میں نے کہا کہ بائبل میں تو شراب کو جائز کرنے والی آیتیں موجود ہیں۔ پھر آپ بائبل کے حوالے سے کس طرح اس کے عدم جواز کو ثابت کریں گے۔

انھوں نے کہا کہ بائبل کے موجودہ انگریزی ترجمہ کی بابت آپ کا کہنا صحیح ہے۔ مگر قدیم عبرانی بائبل سے شراب کا جواز ثابت نہیں ہوتا۔ انھوں نے کہا کہ قدیم عبرانی نسخہ میں اس سلسلہ میں دو الفاظ آتے ہیں۔

زازن (Yayin) یہ لفظ قدیم عبرانی میں انگور کا رس مع الکوہل کے لیے بولا جاتا ہے۔ دوسرا لفظ شکار (Shekar) ہے۔ یعنی انگور کا وہ تازہ رس جو بغیر الکوہل کے ہو بائبل کے موجودہ انگریزی ترجمہ میں یہ غلطی کی گئی ہے کہ مذکورہ دونوں لفظوں کے لیے ایک ہی لفظ (Winc) استعمال کیا گیا ہے۔ حالاں کہ اصل عبرانی میں دو لفظ تھا۔ قدیم عبرانی متن کے مطابق انگور کا سادہ رس جائز ہے اور انگور کا وہ رس جو خمیر کے بعد نشہ آور ہو جائے، جائز نہیں۔

یہ لوگ بہت دلچسپ انداز میں شراب کے خلاف پرچار کرتے ہیں۔ مثلاً ایک لکچر میں انھوں نے شراب نوشی کے خلاف دلائل دیے۔ آخر میں انھوں نے حاضرین کے سامنے دو برتن رکھے۔ ایک برتن میں پانی تھا اور دوسرے برتن میں شراب، اس کے بعد حسب پروگرام ایک گدھا لکچر ہال کے اندر داخل کیا گیا۔ اب لکچرر نے اپنے سامعین سے پوچھا کہ یہ بتائیے کہ گدھا دونوں میں سے کس برتن سے پیئے گا۔ سامنے کی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے ایک شخص نے بلند آواز سے کہا۔ "پانی کے برتن سے" لکچرر نے کہا بہت اچھا جناب۔ اب آپ یہ بتائیں گے کہ کیوں ایسا ہے کہ وہ شراب کے مقابلہ میں پانی کو ترجیح دیتا ہے۔ آدمی نے جواب دیا ــــ کیوں کہ وہ ایک گدھا ہے :

Because he's an ass.

یہاں دنیا بھر کے بہت سے لوگوں سے ملاقات اور تبادلۂ خیال ہوا پروفیسر ہوسٹن اسمتھ

(Prof. Huston Smith) سے بھی ملاقات ہوئی وہ ۱۹۸۵ میں ہمارے مرکز (نئی دہلی) میں آئے تھے۔ وہ موجودہ کانفرنس کی پلاننگ کمیٹی کے ممبر بھی ہیں۔

امریکہ کے بارے میں کچھ مزید باتیں حسب ذیل ہیں :

ایک امریکی ایجنسی نے ۱۹۸۴ کے آغاز میں ایک رپورٹ تیار کی تھی۔ یہ رپورٹ ہندستانی اخبار ٹائمس آف انڈیا (۲۶ فروری ۱۹۸۴) میں بھی حسب ذیل عنوان کے ساتھ شائع ہوئی تھی :

Indians in US best educated minority

اس رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ امریکہ میں رہنے والے ہندستانی وہاں کی سب سے بہتر تعلیم یافتہ جماعت ہیں۔ اور اس بنا پر وہ امریکہ کے سب سے زیادہ خوش حال گروہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ امریکہ میں تقریباً نصف ملین ہندستانی بستے ہیں۔ یہ لوگ اپنے آپ کو ہندستانی امریکی (Indian Americans) کہلانا پسند کرتے ہیں۔ مگر خود امریکی لوگ انھیں ایشیائی امریکی (Asian Americans) کہتے ہیں۔

یہ ہندستانی امریکی اکثر اعلیٰ لیاقت کے لوگ ہیں۔ وہ ڈاکٹر، پروفیسر، وکیل، انجینیر، اکاؤنٹنٹ اور سائنٹسٹ ہیں۔ بعض نے یہاں اپنا ذاتی بزنس شروع کر رکھا ہے۔ ان میں ایک تعداد وہ ہے جو کروڑپتی ہے۔ اور کچھ وہ ہیں جن کے پاس اپنا ذاتی ہوائی جہاز ہے :

Some even own aircraft for their private use.

رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ ہندستانی امریکیوں کی اوسط خاندانی آمدنی ۲۴۹۹۳ ڈالر سالانہ ہے۔ جب کہ خود امریکیوں کی اوسط خاندانی آمدنی ۱۹۹۱۷ ڈالر سالانہ ہے :

The median family income of the Indian American community is $ 24,993 per year while the average for the all U.S. median family income is only $ 19,917.

امریکہ کی اصل آبادی میں برتر لیاقت کے لوگ بھی ہیں اور کم تر لیاقت کے لوگ بھی۔ مگر ہندستان سے جو لوگ امریکہ جاتے ہیں وہ سب منتخب لوگ ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی برتر قابلیت کے بل پر وہاں جانے کا حوصلہ کرتے ہیں اور اسی بنا پر وہاں کے مقابلوں کا سامنا کرتے ہوئے اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

ہندستان جیسے ملک کی اقلیتوں کے لیے اس میں بڑا سبق ہے۔ یہاں اکثریتی فرقہ کے لوگوں کو

سفارش اور جانب داری کے تحت بھی جگہیں مل جاتی ہیں اس لیے اکثریتی فرقہ سے ہر قسم کے لوگ دفتروں اور اداروں میں بھر رہے ہیں۔ اس کے برعکس جب کوئی مسلمان لیا جاتا ہے تو وہ اپنی ممتاز لیاقت کی بنا پر لیا جاتا ہے۔ یہ گویا ایک قسم کا قدرتی انتخاب ہے۔ اس طرح اقلیت کے ٹاپ کے لوگ اوپر آتے رہیں گے۔ حتی کہ ایک وقت آئے گا جب کہ اکثریت کی نمائندگی اس کے مخلوط افراد کر رہے ہوں گے اور اقلیت کی نمائندگی اس کے ٹاپ کے افراد۔

عام شہرت کے مطابق امریکہ دنیا کا سب سے زیادہ خوش حال ملک ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ امریکہ کی خوشحالی حقیقی سے زیادہ مصنوعی ہے۔ امریکہ کی خوشحالی کا راز قرض ہے۔ امریکہ دنیا میں سب سے زیادہ سود دیتا ہے۔ چنانچہ دنیا بھر میں لوگ امریکہ کے بنکوں اور تجارتی اداروں میں اپنا سرمایہ لگاتے ہیں۔ ایک رپورٹ کے مطابق ۱۹۸۵ کے آخر میں امریکہ کے اوپر بیرونی قرضوں کی مقدار تقریباً پانچ سو بلین ڈالر ہے اس قرض میں امریکہ کو ہر سال تقریباً پچاس بلین سود ادا کرنا ہوتا ہے۔

زیادہ شرح سود کا براہ راست فائدہ امریکہ کو یہ ملا کہ اس کی کرنسی (ڈالر) کی اہمیت بڑھ گئی۔ آج کرنسی کی دنیا میں ڈالر کو "شہنشاہ" کا مقام حاصل ہے۔ آپ ہندستانی سکہ لے کر باہر کی دنیا میں جائیں تو اس کی حیثیت وہی ہوگی جو شیخ سعدی نے اپنے اس شعر میں بیان کی ہے :

امیر زادۂ ناداں بہ شہر روا ماند　　　که در دیار غریبش بہ ہیچ نستانند

لیکن اگر آپ کے پاس ڈالر ہے تو دنیا کے ہر حصہ میں خالص سونے کی مانند آپ اس کی قیمت پا سکتے ہیں۔

اس سودی معاشیات کا سب سے بڑا نقصان ہتھیاروں کی بڑھتی ہوئی تجارت ہے۔ امریکہ کو جب ہر سال پچاس بلین ڈالر سود ادا کرنا ہے تو ضروری ہے کہ وہ اپنی جمع شدہ رقم کو زیادہ سے زیادہ نفع بخش تجارت میں لگائے۔ موجودہ زمانہ میں سب سے زیادہ نفع بخش تجارت جنگی ہتھیار ہے۔ چنانچہ امریکہ بالقصد ساری دنیا میں جنگ کی آگ بھڑکاتا رہتا ہے تاکہ اس کی جنگی صنعت کے مستقل خریدار حاصل رہیں۔ یہاں باقاعدہ ایسے جرائد شائع ہوتے ہیں جن میں ہتھیاروں کی ہلاکت خیزی کی تفصیل درج ہوتی ہیں۔ کہ اگر آپ ہم سے فلاں ہتھیار خریدیں تو اس کے ذریعہ آپ اتنی زیادہ تباہی برپا کر سکتے ہیں۔ اسلحہ کی اس تجارت کی کم از کم جزئی ذمہ داری سودی معاشیات پر ہے۔ امریکہ اگر ہتھیاروں کی صنعت کو مسلسل نہ بڑھائے تو وہ اپنے اوپر بڑھتے ہوئے عالمی سود کو ادا کرنے کے قابل نہ رہے گا۔

امریکہ میں جرائم کے بارے میں ایک رپورٹ یہ ہے :

One in three families in the U.S. were victims of a crime and a U.S. citizen was murdered every half hour last year, according to a survey carried out by the U.S. department of justice. In 1983, 36 million 900 thousand crimes were committed in the country, reports *Public-Pool* from Montreal.

امریکہ میں جدید ترقیاں اپنے کمال کو پہونچ رہی ہیں اس کے باوجود وہاں سب سے زیادہ جرائم ہوتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جرائم کا مادی ترقیات سے کوئی تعلق نہیں۔

کچھ لوگ غلط طور پر یہ کہتے ہیں کہ جرائم غریبی کے ساتھ جنم لیتے ہیں۔ اگر تمام لوگ خوش حال ہو جائیں تو جرائم اپنے آپ ختم ہو جائیں گے۔ مگر جدید دنیا کا تجربہ اس کے خلاف ثبوت پیش کرتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ جرائم کا سبب انسان کی آزادی ہے۔ انسان چوں کہ موجودہ دنیا میں اپنے آپ کو آزاد محسوس کرتا ہے اس لیے وہ جہاں موقع پاتا ہے اپنی آزادی کا غلط استعمال کرتا ہے جس کا دوسرا نام جرم ہے۔

انسان کو جرم سے باز رکھنے کی ایک ہی صورت ہے اور یہ کہ اس کو ایسا نظریہ دیا جائے جو اس سے اس کی آزادئ عمل چھین لے۔ جو اس کو پابند زندگی گزارنے پر مجبور کرے۔ جو اس سے کہے کہ تمہاری آزادی ناحق کو چھوڑنے اور حق کو اختیار کرنے کے لیے ہے نہ کہ من مانی کارروائی کرنے کے لیے

ایسا نظریہ خدا کے آگے جواب دہی (Accountability) کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔

ایک ہندستانی ۱۹۴۷ کے انقلاب کے بعد امریکہ گیا۔ وہاں اس نے کافی دولت کمائی۔ اس کی ہندستانی بیوی سے اس کے یہاں دو لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ ۱۹۶۹ میں اس کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت اس کی لڑکیاں اسکول میں تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔ اپنی لڑکیوں کی خاطر اس نے دوسری شادی نہیں کی۔ لڑکیاں یونیورسٹی میں پہونچیں تو حالات بدلنا شروع ہوئے۔ اس کی بڑی لڑکی نے اپنی آزاد مرضی سے ایک امریکی لڑکے سے شادی کر لی۔ تاہم صرف تین ماہ بعد اس سے طلاق ہو گئی۔ اس کے بعد لڑکی نے باپ کا گھر چھوڑ دیا۔ وہ باہر رہنے لگی۔ چھوٹی لڑکی نے بھی ایک امریکی لڑکے سے اپنی ذاتی پسند کے تحت شادی کر لی۔ مگر اس سے بھی ایک سال کے اندر علیحدگی ہو گئی۔ یہ لڑکی بھی باپ سے الگ ہو کر باہر نیویارک میں رہنے لگی۔

باپ کو اس کا بے حد رنج تھا۔ اس نے بیوی بھی کھوئی اور آخر میں دونوں لڑکی بھی کھو دی۔ اس نے ایک روز اپنی ایک لڑکی سے کہا کہ تم جو کچھ کر رہی ہو وہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ لڑکی نے فوراً جواب دیا کہ

پ یہاں لمبی مدت سے رہ رہے ہیں۔ آپ کو خود یہ بات جاننا چاہیے :

You have lived here long enough and you should understand.

ان تلخ تجربات کے بعد آدمی کا دل ٹوٹ گیا۔ اس نے امریکہ میں اپنا بزنس فروخت کر دیا اور دہلی واپس آگیا۔ دہلی میں اس کے پاس بہت بڑا مکان ہے۔ اس کے پاس دو شوفر ہیں۔ چار مالی ہیں اور دوسرے بہت سے گھریلو ملازم ہیں۔ مگر وہ آدمی تنہا ہے۔ اس کے لیے دنیا میں اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ شراب پی کر اپنا غم بھلاتا رہے۔ (ٹائمس آف انڈیا، ۲۰ اگست ۱۹۸۵ صفحہ ۸)

امریکی بزنس کس طرح چلتی ہے، اس کی ایک دلچسپ مثال کوکا کولا ہے۔ آج ۱۳۵ ملکوں میں اس کے ۱۹۰ ملین بوتل روزانہ فروخت ہوتے ہیں۔ کوکا کولا کے اجزار ۱۸۸۶ میں پمبرٹن (John S. Pemberton) نے دریافت کیے تھے۔ اس وقت سے آج تک اس کا فارمولا ایک راز ہے جس کو صرف کمپنی کے چند ڈائرکٹر جانتے ہیں۔ کوکا کولا کے کارخانے ساری دنیا میں ہیں۔ مگر اس کا اصل جزء آج بھی صرف امریکہ میں تیار کیا جاتا ہے۔ تاکہ اس کا راز باقی رہے۔ اس سے پہلے یہ راز صرف چند دماغوں میں تھا ب وہ کاغذ پر لکھ کر بینک میں مقفل کر دیا گیا ہے۔ اس مقفل بکس کو صرف کمپنی کے ڈائرکٹر ہی کھول سکتے ہیں۔

ہندستان میں کوکا کولا کے ۲۲ کارخانے تھے۔ وہ ہندستان کا سب سے زیادہ مقبول مشروب (Soft drink) تھا۔ ۱۹۷۷ میں جنتا حکومت نے چاہا کہ اس کو (Indianise) کرے۔ اس مقصد کے لیے کمپنی کو اپنا فارمولا ہندستانی حکومت کو بتانا پڑتا۔ کمپنی نے اپنا فارمولا راز میں رکھنے کی یہ قیمت ادا کی کہ یک لخت ہندستان میں اپنا بزنس ختم کر دیا۔ مگر اپنا فارمولا ہندستانی حکومت کو بتانے پر راضی نہیں ہوئی۔

امریکہ میں پروسس کی ہوئی شکر جتنی تیار ہوتی ہے اس کا دس فی صد صرف کوکا کولا کمپنی خریدتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کوکا کولا میں کافین (Caffeine) کا ایک جزء ڈالا جاتا ہے۔ یہ ایک بے حد تلخ چیز ہے۔ اس کی تلخی کو گھٹانے کے لیے اس میں سب سے زیادہ جو چیز ڈالی جاتی ہے وہ شکر ہے۔

۱۹۵۴ میں مراکو میں یہ افواہ اڑگئی کہ کوکا کولا میں خنزیر کے خون کی ملاوٹ ہوتی ہے۔ اس کے بعد وہاں کافی شور ہوا اور مسلمانوں نے کوکا کولا پینا چھوڑ دیا۔ اس کے بعد کمپنی والوں نے سلطان مراکو کے صاحبزادے کو آمادہ کیا۔ انھوں نے مجمع عام میں لوگوں کے سامنے کوکا کولا پی کر اس کی تردید کی۔ اس

طرح یہ فضا ختم ہوئی۔

امریکی قانون کے مطابق کسی تیار شدہ خوراک کے اجزار کا اعلان ضروری ہے۔ چنانچہ ۱۹۰۹ میں کوکا کولا کمپنی کے خلاف حکومت نے مقدمہ قائم کیا اور چاہا کہ عدالتی طور پر اس کو مجبور کرے کہ وہ اس کے اجزار کا اعلان کرے۔ کمپنی نے مقدمہ کی پیروی کی یہاں تک کہ وہ جیت گئی۔ اس کے وکیلوں نے یہ ثابت کیا کہ شناختی معیار (Standard of identity) کو باقی رکھنے کے لیے کوکا کولا کے فارمولا کا راز میں رہنا ضروری ہے۔

خارجی دنیا میں اپنی حیثیت کو بڑھانے اور اپنے مفادات کا تحفظ کرنے کے لیے امریکہ جتنا خرچ کرتا ہے اتنا شاید ساری تاریخ میں کبھی کسی قوم نے نہیں کیا۔ مگر امریکہ کی خارجہ پالیسی اس نسبت سے کامیاب پالیسی نہیں۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ کا حوالہ دینا کافی ہوگا۔

ترکی سوویت روس کی سرحد پر واقع ہے۔ اس اعتبار سے امریکہ کے لیے اس کی بے حد اہمیت ہے۔ چنانچہ امریکہ نے ترکی سے تعلقات بڑھائے اور یہاں اس نے اپنے ۲۰ سے زیادہ فوجی اڈے قائم کر لیے۔ ان اڈوں کا خاص مقصد روس کی جنگی تیاریوں کی نگرانی کرنا تھا۔ مگر ۱۹۷۴ میں ترکی اور یونان میں کشمکش پیدا ہوئی۔ ترکی نے قبرص میں آباد ترک باشندوں کی حفاظت کے لیے قبرص میں اپنی فوجیں داخل کر دیں۔ اس وقت ترکی کی امیدوں کے خلاف امریکہ نے یونان کا ساتھ دیا۔ حتی کہ اس نازک وقت میں ترکی کو اسلحہ بھیجنے پر پابندی لگا دی جس کا راستہ اس سے پہلے اس کے لیے آزادانہ طور پر کھلا ہوا تھا (ریڈرز ڈائجسٹ مئی ۱۹۷۶)

اس نازک موقع پر امریکہ کا ساتھ چھوڑنا ترکی کے لیے بہت تلخ تجربہ تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے ملک میں امریکہ کے تمام فوجی اڈے بند کر دیئے۔ ۳۰ سالہ تعلق یک لخت ختم ہو گیا۔ اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ولیم گریفتھ (William E. Griffith) نے لکھا ہے کہ اگر روسی یہ سب کرنا چاہتے تو وہ بھی اس سے زیادہ کامیابی کی امید نہیں کر سکتے تھے۔

If the Russians had set out to accomplish all this, they could not have hoped for more success.

تاہم یہ حادثہ خود ترکی کے لیے بہت مفید ثابت ہوا۔ ترکی اب تک اپنا رشتہ مغربی دنیا سے جوڑتا

تھا۔ اس تلخ تجربہ نے اس کی خوش گمانیوں کا غبارہ توڑ دیا۔ اس کے بعد اس کی توجہات مسلم دنیا کی طرف مڑ گئیں۔ ترکی کے صدر نے اس کے بعد سے بے شمار مرتبہ عرب دنیا کے دورے کیے ہیں۔ عرب لوگ کثرت سے ترکی جانے لگے ہیں۔ عربوں کو ترکی میں ایسی رعایتیں دی گئی ہیں جو اس سے پہلے انھیں حاصل نہ تھیں۔ مثلاً ایک قانون میں تبدیلی کر کے اس کی گنجائش پیدا کی گئی کہ عرب ترک شہروں میں جائداد خرید سکتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

مسلم دنیا سے اس تعلق کے بالواسطہ نتیجہ کے طور پر ترکی میں اسلام اور اسلامی تحریک کو نئے مواقع مل گئے جو کمال اتاترک اور عصمت انونو نے ختم کر رکھے تھے۔ جدید ترکی میں دوبارہ اسلام زندہ ہو رہا ہے اور یہ نتیجہ ہے امریکہ کی اس سیاست کا جو اس نے ۱۹۷۴ میں قبرص کے معاملہ میں اختیار کی تھی۔

۲۲ نومبر ۱۹۸۵ کو میں دہلی واپس پہونچا۔

خدا کو پانا سب سے بڑی حقیقت کو پانا ہے۔ کوئی آدمی جب خدا کو پاتا ہے تو یہ اس کے لیے ایک ایسی دریافت ہوتی ہے جو اس کی پوری زندگی کو ہلا دیتی ہے۔ وہ ایک ناقابلِ بیان ربانی نور میں نہا اٹھتا ہے، وہ ایک نیا انسان بن جاتا ہے۔ اس کی سوچ، اس کا عمل اور اس کی تمام کارروائیاں ایک ایسے انسان کی کارروائیاں بن جاتی ہیں جو خدا کے ظہور سے پہلے خدا کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔

ہدیہ: ۴۰ روپیہ
۳۰ روپیہ (رعایتی اڈیشن)

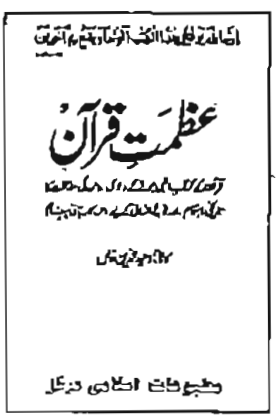

قرآن اپنی ذات میں اس بات کی دلیل ہے کہ وہ خدا کی کتاب ہے۔ وہ اُسی ابتدائی صورت میں کامل طور پر محفوظ ہے جیسا کہ وہ ساتویں صدی عیسوی میں پیغمبر عربی صلی اللہ علیہ وسلم پر اترا تھا۔ ان خصوصیات نے قرآن کے پیغام کو اتنا طاقتور بنا دیا ہے کہ جب بھی وہ دنیا کے سامنے اپنی اصلی شکل میں لایا جائے گا وہ اقوامِ عالم کو مسخر کر لے گا۔

ہدیہ: ۲۵ روپیہ
۱۸ روپیہ (رعایتی اڈیشن)

اسلامیت کیا ہے

لوگ کلمہ کے الفاظ دہراتے ہیں مگر ان کے کلمہ میں عرفانِ حق کی گہرائی نہیں۔ لوگ نماز پڑھتے ہیں اور روزہ رکھتے ہیں مگر ان کی نمازوں میں خشوع نہیں اور ان کے روزوں میں خوفِ خدا کی تڑپ نہیں۔ لوگ اپنے مومن ہونے پر فخر کرتے ہیں مگر ان کے ایمان نے ابھی تک انھیں خدا کا دیدار نہیں کرایا۔

لوگ اپنے کو دیندار سمجھتے ہیں مگر ان کی دینداری احتسابِ خویش سے خالی ہے۔ ان کی دینداری نے انھیں نہیں بتایا کہ وہ اپنے آپ کو ٹٹولیں اور اپنے اندر جھانک کر دیکھیں کہ وہ کیا ہیں اور کیا نہیں ہیں اجتماعی مواقع پر لوگ دین کے خادم بنے ہوئے ہیں مگر ان کی تنہائیوں نے ابھی تک ان کے خادمِ دین ہونے کی گواہی نہیں دی۔ لوگ معمول کے حالات میں خوش اخلاق نظر آتے ہیں مگر جب غیر معمولی حالات پیدا ہوں تو وہ ایسے بن جاتے ہیں جیسے کہ انھوں نے خوش اخلاقی کا نام بھی نہیں سُنا۔

لوگ اجتماعات میں تقریر کرکے سمجھتے ہیں کہ وہ دین کے داعی ہیں۔ حالاں کہ دین کا داعی وہ ہے جو رات کی تنہائیوں میں لوگوں کی ہدایت کے لیے اللہ سے دعا کرتا ہو۔ داعی وہ ہے جو اپنے مدعو کے لیے اتنا شفیق ہو کہ اس کی اصلاح کی خاطر یک طرفہ طور پر اس سے اپنی تمام شکایتیں ختم کر دے۔

لوگ انسانوں کے نزدیک دین دار بنے ہوئے ہیں۔ حالاں کہ دین دار وہ ہے جس نے خدا کے نزدیک دین دار ہونے کا ثبوت دیا ہو۔ لوگ بھیڑ کے سامنے اپنی اسلامیت کا مظاہرہ کر رہے ہیں حالاں کہ اسلامیت صرف وہ معتبر ہے جس کو نہ دکھائی دینے والے فرشتوں نے دیکھا ہو اور آخرت میں کھلنے والے رجسٹر میں جس کا اندراج ہوا ہو۔

آدمی ایک پھل کھائے تو وہ جانتا ہے کہ پھل نام ہے مغز کا نہ کہ چھلکے کا۔ آدمی کسی سے محبت کا امیدوار ہو تو وہ جانتا ہے کہ محبت نام ہے دل کے تعلق کا نہ کہ رسمی آداب کا۔ مگر کیسی عجیب بات ہے کہ یہی لوگ اس بات سے بالکل بے خبر ہیں کہ دین نام ہے حقیقت کا۔ خدا پرستی یہ ہے کہ آدمی اللہ کے جلال سے کانپے، اللہ کی یاد اس کی روح کی غذا بن جائے۔

عجیب لوگ

الرسالہ (اکتوبر ۱۹۸۵) میں ایک مضمون چھپا تھا جس کا عنوان تھا "الفاظ کا رجسٹر"۔ اس میں دکھایا گیا تھا کہ اردو زبان میں معیار بندی نہ ہونے کی وجہ سے یہ صورت حال ہے کہ بڑے بڑے لکھنے والے بھی اپنی تحریروں میں ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جو جدید اصطلاح میں رجسٹر کے باہر کے الفاظ ہوتے ہیں۔

اس مضمون کو پڑھ کر ایک صاحب نے ہمیں پرجوش خط روانہ کیا ہے۔ ان کو اس مضمون پر سخت اعتراض ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس مضمون کو پڑھنے کے بعد میں نے اردو زبان کے بہت سے شاعروں اور ادیبوں سے "انکوائری" کی کہ کیا ایسا کوئی رجسٹر موجود ہے مگر ہر ایک نے ایسے رجسٹر سے لاعلمی کا اظہار کیا۔

انھوں نے لکھا ہے کہ ممکن ہے انگریزی زبان میں ایسے رجسٹر موجود ہوں مگر اردو میں ابھی تک ایسی کوئی کتاب نہیں چھپی ہے جس میں رجسٹر کے اعتبار سے الفاظ کی تقسیم کی گئی ہو۔ ایسی حالت میں اردو کے اہل قلم حضرات کو کیوں کر اس بات کا مجرم قرار دیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنی تحریروں میں رجسٹر کے باہر کے الفاظ استعمال کیے۔ جب خود رجسٹر کا وجود نہیں تو کیسے فیصلہ کیا جائے گا کہ فلاں لفظ رجسٹر کے باہر ہے اور فلاں لفظ رجسٹر کے باہر نہیں۔

ہر پڑھا لکھا آدمی جانتا ہے کہ مذکورہ مضمون میں "الفاظ کا رجسٹر" سے مراد ذہنی رجسٹر ہے نہ کہ کوئی مطبوعہ رجسٹر۔ اس قسم کا رجسٹر ہمیشہ غیر مکتوب ہوتا ہے نہ کہ مکتوب۔ جو لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے انھیں کم از کم اپنی بے خبری کو جاننا چاہیے تاکہ وہ جاننے والے سے پوچھیں۔ کیسے عجیب ہیں وہ لوگ جو نہیں جانتے، مزید یہ کہ وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ نہیں جانتے۔

یہی وجہ ہے کہ لوگ وہاں بولتے ہیں جہاں انھیں چپ رہنا چاہیے۔ لوگ وہاں دوسرے کی غلطی کا اعلان کرنے کھڑے ہو جاتے ہیں جہاں ان سے مطلوب تھا کہ اپنی کوتاہی کا اعتراف کریں۔ لوگ صرف بولنے کو کام سمجھتے ہیں حالاں کہ چپ رہنا بھی ایک کام ہے۔ لوگ اپنی واقفیت کے اظہار کو کمال سمجھتے ہیں حالاں کہ اپنی ناواقفیت کا اعتراف بھی کم کمال کی بات نہیں۔

خبرنامہ اسلامی مرکز — ۱۸

۱۔ ۲۶ جنوری ۸۶ کو مہینہ کا آخری اتوار تھا۔ حسب معمول مرکز کا ماہانہ اجتماع نماز مغرب کے بعد ہوا۔ صدر اسلامی مرکز نے سورہ نساء (آیت ۶۰۔ ۵۹) کی روشنی میں درس دیا۔ موصوف نے قرآن کی اس آیت کو موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے حالات پر منطبق کرتے ہوئے تقریباً آدھ گھنٹہ تک اس کی تشریح کی۔

۲۔ ۲۷ جنوری ۱۹۸۶ کو انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز (نئی دہلی) کے زیر اہتمام اہل علم کا ایک اجتماع ہوا۔ اس کا عنوان تھا :

Islam and Contemporary Problems

اس موقع پر صدر اسلامی مرکز نے صدر جلسہ کی حیثیت سے ایک تقریر کی۔ اس تقریر میں انھوں نے اس نقطہ نظر کی تردید کی کہ زمانہ کی کسی تبدیلی کی وجہ سے اس کی ضرورت پیش آگئی ہے کہ اسلامی شریعت کے قوانین پر نظر ثانی کی جائے۔

۳۔ ۲۳ جنوری ۱۹۸۶ کو نئی دہلی میں ایک میٹنگ ہوئی۔ اس میٹنگ کو ایک ہندو تنظیم نے منعقد کیا تھا اور اس میں زیادہ غیر مسلم حضرات شریک تھے۔ صدر اسلامی مرکز کو اس موقع اظہار خیال کی دعوت دی گئی۔ انھوں نے تقریباً آدھ گھنٹہ کی تقریر میں اسلام کے تصور آخرت کو پیش کیا۔

۴۔ بھوپال میں حلقہ الرسالہ کی طرف سے ایک اجتماع ۱۹۔۲۰۔۲۱ اپریل ۱۹۸۶ کو ہو رہا ہے۔ اس میں دہلی سے صدر اسلامی مرکز بھی شرکت کریں گے۔ مقامی پتہ یہ ہے :

بنارسی کلاتھ اسٹورس۔ ابراہیم پورہ۔ بھوپال

ٹیلی فون نمبر ۷۵۸۹۴

۵۔ جدہ (سعودی عرب) میں اسلامی جرائد کی ایک نمائش فروری ۱۹۸۶ میں ہوئی۔ اس موقع پر دوسرے اسلامی جرائد کے ساتھ ماہنامہ الرسالہ کے انگریزی اور اردو شمارے بھی ذمہ داروں کی طرف سے نمائش کے لیے رکھے گئے۔ اسی طرح کیپ ٹاؤن (ساؤتھ افریقہ) میں مارچ ۱۹۸۶ میں اسلامی لٹریچر کی نمائش ہوئی۔ اس موقع پر بھی اس کے ذمہ داروں نے الرسالہ اور

مکتبہ الرسالہ کی مطبوعات کو منگوا کر نمائش کے لیے رکھا۔

۶۔ "الرسالہ کیسٹ" کے ذریعہ خدا کے فضل سے الرسالہ اور اسلامی مرکز کا پیغام ان لوگوں تک بھی پہونچ رہا ہے جو اردو زبان پڑھ نہیں سکتے البتہ سن کر سمجھ سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک نئی بات یہ علم میں آئی کہ باہر کے ملکوں کے نوجوان جو کئی سال تک ہندستان میں زیر تعلیم رہنے کی وجہ سے اردو بول چال سمجھنے لگے ہیں وہ بھی الرسالہ کیسٹ سے دل چسپی لے رہے ہیں۔ چنانچہ دفتر میں سوڈان کے ایک نوجوان کا خط موصول ہوا ہے، وہ ہندستان کی ایک یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہیں۔ انھیں کسی ذریعہ سے ایک کیسٹ ملا تھا۔ اب وہ ہر کیسٹ کو سننا چاہتے ہیں اور اس کے مستقل خریدار بن گیے ہیں۔

۷۔ انگریزی الرسالہ خدا کے فضل سے دن بدن لوگوں کے دلوں میں اپنی جگہ بنا رہا ہے۔ ۳ جنوری کو ایک مسلم ملک کے سفارت خانہ کے کلچرل اتاشی اچانک مرکز میں آئے۔ انھوں نے صدر اسلامی مرکز سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ آج ہی میں نے آپ کا انگریزی الرسالہ دیکھا۔ وہ مجھ کو بہت پسند آیا اور میں فوراً ملاقات کے لیے آگیا:

قرأتُ الرسالة وفرحتُ جداً وحضرتُ فوراً

وہ انگریزی زبان اچھی جانتے ہیں۔ انھوں نے پیش کش کی کہ اگر زبان کے اعتبار سے کسی مدد کی ضرورت ہو تو میں اس کے لیے حاضر ہوں (اذا اردتم المساعدة من ناحية اللغة فانا موجود)

۸۔ بنگلور میں اسلامی مرکز کی شاخ نے اطلاع دی ہے کہ اس نے کنڑی زبان میں کچھ ترجمے تیار کر لیے ہیں۔ انشاء اللہ وہ جلد ہی شائع کیے جائیں گے۔

۹۔ ساتویں عالمی کتابی نمائش (ورلڈ بک فیئر) نئی دہلی میں فروری ۱۹۸۶ میں ہوئی۔ اس موقع پر اسلامی مرکز کا ایک اسٹال لگایا۔ اسلامی مرکز کے بک اسٹال کا نمبر ۲۶۰ تھا۔ اس موقع پر کثیر تعداد میں لوگ اسٹال پر آئے۔ بہت سے لوگوں نے کتابیں خریدیں، الرسالہ کی خریداری قبول کی اور اعلیٰ تاثرات کا اظہار کیا۔ یہاں بطور نمونہ چند تاثرات نقل کیے جاتے ہیں:

قوّاكم الله وبارك في جهودكم (ڈاکٹر شفیق احمد ندوی، جامعہ ملیہ نئی دہلی)

"اسلامک سینٹر کے اسٹال پر حاضری کی تمنا کئی روز سے تھی ۔ الحمدللہ آج اس کا موقع ہاتھ آیا میں جناب مولانا وحید الدین خاں صاحب کی نگارشات کا برسوں سے مطالعہ کر رہا ہوں لیکن یہ اندازہ بالکل نہ تھا کہ مولانا محترم نے اس قدر کتابیں تصنیف فرمائی ہوں گی۔ کمیت اور کیفیت دونوں ہی قابل تعریف ہیں۔ مولانا کی تحریر نہایت فکر انگیز اور جدید ذہن کے عین مطابق ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر کی عکاسی جس خوبی سے مولانا نے اپنی تصانیف میں کی ہے اس کی مثال کہیں اور مشکل سے ملے گی ۔ ڈاکٹر ثانی اثنین صاحب بھی مبارکباد کے قابل ہیں کہ انھوں نے اپنے اسٹال کو ایسا منظم کر رکھا ہے کہ ایسا سلیقہ کسی اور اسلامی اسٹال میں میں نے نہیں دیکھا۔"

Dr. Syed Ausaf Ali, Indian Institute of Islamic Studies, New Delhi

I welcome such publications so that even non-Muslims may understand the greatness of Islamic religion and culture.

N.S. Saksena, 139 Civil Lines, Bareilly 243001

Is it possible for a person to write so much. Perhaps not but with the grace of God.

Shabi Ahmed, LCHR, 35 Feroz Shah Road, New Delhi.

۱۰۔ ۲۱ فروری ۸۶ کو نئی دہلی میں مسلم اور ہندو اہل فکر کی ایک میٹنگ ہوئی۔ اس میٹنگ کا مقصد اس صورت حال پر غور کرنا تھا جو بابری مسجد کے سلسلے میں حال میں ملک کے اندر پیدا ہوئی ہے۔ صدر اسلامی مرکز بھی اس موقع پر شریک ہوئے اور اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

۱۱۔ تذکیر القرآن کی تحریر اور کتابت کا کام خدا کے فضل سے مسلسل جاری ہے۔ اس کے ستائیس پارے تک تیار ہو گیے ہیں۔ انشاء اللہ امید ہے کہ ۱۹۸۶ میں اس کی دوسری جلد چھپ کر آجائے گی۔

۱۲۔ پیغمبر انقلاب کا انگریزی ترجمہ چھپ کر تیار ہو گیا ہے اور حسب فرمائش اس کی روانگی شروع جلد ہی شروع ہو جائے گی۔

۱۳۔ اسلامی مرکز کے لٹریچر کو ہندی میں منتقل کرنے کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی تھی۔ چنانچہ اس کا آغاز کر دیا گیا ہے۔ پہلی کتاب کے طور پر "انسان اپنے کو پہچان" کا ہندی ترجمہ اس وقت زیر طبع ہے۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کر دیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۳۶ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۰۰ روپیہ

بیرونی ممالک سے

ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

Regd. No. D(SE) 243
Regd. R.N. No. 28822/76

April 1986
Number 113

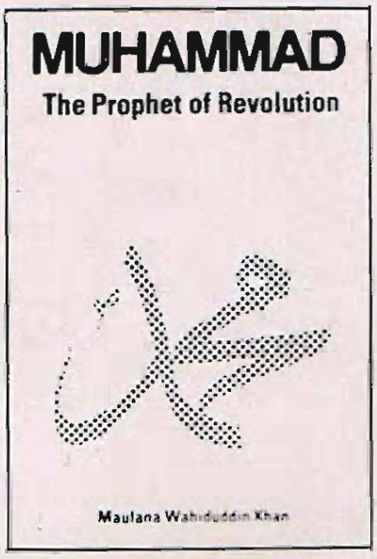

MUHAMMAD

The Prophet of Revolution

By

Maulana Wahiduddin Khan

In making the Prophet Muhammad the greatest figure, and consequently one of the most resplendent landmarks in human history, God has bestowed his greatest favour on mankind. Whoever seeks guidance cannot fail to see him, for he stands out like a tower, a mountain on the horizon, radiating light like a beacon, beckoning all to the true path. It is inevitable that the seekers of truth will be drawn up to the magnificent pinnacle on which he stands.

ISBN 81-85063-00-1 (PB Rs 50 $ 5)
ISBN 81-85063-07-9 (HB Rs 90 $ 9)

Maktaba Al-Risala
C-29 Nizamuddin West New Delhi - 110013